www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

ستمبر 2018

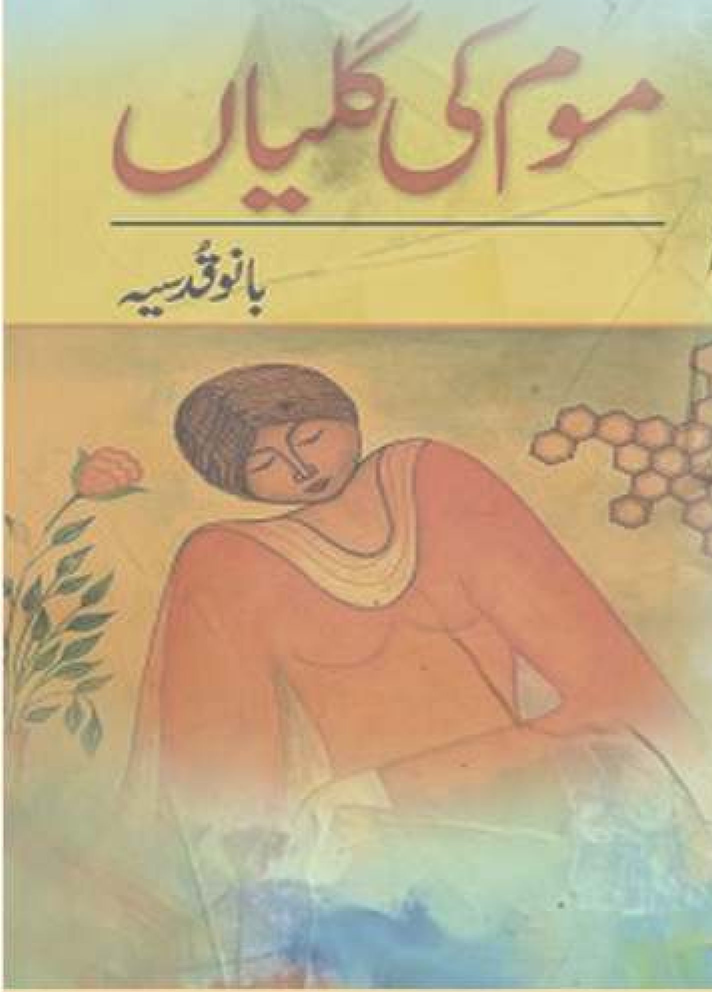

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے | جلد: 2 شمارہ: 9 ستمبر 2018 | صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں
نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ
مکالمہ — مدیر

پرواز کے نئے آسمان
عالیہ تبسم: مالیگاؤں کی پہلی...... — مختار عدیل — 5

نکہت سخن
شاعرات کے منتخب اشعار — 7

جہان نسواں
عصمت چغتائی کے افسانوں...... — سفینہ سماوی — 8
میڈیا اور اردو زبان — مسرت فردوس — 12
مسلسل کاوشوں سے ہی...... — سید نوشاد بیگم محمود — 16
کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت — گلشن آرا — 18
موم کی گلیاں تجزیاتی مطالعہ — عقیلہ — 21
رفقائے سرسید اور تعلیم نسواں — حدیثہ افضل — 24
اقلیتی طبقات کی خواتین کی...... — خواجہ عبدالمنتقم — 30

کہانیاں
آخر کب تک — نعیمہ جعفری پاشا — 34
پیاسی ممتا — ذاکرہ شبنم — 38
تخلیق کار — خلیق النساء — 42
شنل نمبر 5 — لالی چودھری — 45
ایماندار — چشمہ فاروقی — 49

حسن سخن
ذکیہ شیخ مینا 52، نینا عادل 53، خالدہ عظمی 53، حمیرا رحمان 54، حیا لکھنوی 54

باورچی خانہ
لذیذ پکوان — 55

صحت
آخری ڈینگو ہے کیا بلا؟ — شہبا خاتون — 57

آرائش وزیبائش
حسن کی نگہداشت — 59
تاثرات: نگر نگر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقام اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

فنونِ لطیفہ سے انسانوں کی ذہنی ہم آہنگی اور اس فن کے ذریعہ نت نئے کارنامے انجام دینے والے انسانوں کے تمام ذخیرۂ ادب کو جمع کیا جائے تو اس میں سے بیشتر متن کا مرکزی کردار عورت ہی ہوگی۔ ہر ایک داستان چاہے اسے لکھا گیا ہو یا زبانی سنایا جاتا رہا ہو اور سینہ بہ سینہ صدیوں سے ہر زبان اور ہر ملک کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے علاقے میں موجود تمام کہانیوں، قصوں، ڈراموں اور شاعری میں کہیں واضح اور کہیں دھندلے عکس اگر نظر آتے ہیں تو وہ صنف نازک کے عکس ہیں جس سے منعکس ہو کر تہذیب و ثقافت کی دنیا کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ عورتوں کے وجود اور ان کی سعیٔ بے پناہ سے وجود میں آنے والے معاشرے میں انھیں قصداً حاشیے پر ڈال دیا گیا، ہم اگر انسانوں کے کسی مہذب معاشرے کا تصور کرتے ہیں تو اس میں خواتین کا رول سب سے اہم ہوتا ہے لیکن ہم یہ سب جانتے ہوئے بھی اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے کہ خواتین کو ہم نے اپنے معاشرے کے کسی دور افتادہ حصے تک محدود کر دیا ہے۔

صنفی کشمکش کی کہانی بھی طویل ہے۔ طبقاتی کشمکش کی طرح جہاں بورژوا اور پرولتاریہ طبقے کی طرح کشمکش کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مرد (بورژوا) عورت (پرولتاریہ) کا استحصال بند کر دے اور خواتین کو اپنے وجود کی بقا کے لیے، اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے، ایک گھر حاصل کرنے کے لیے یہاں تک کہ زندہ رہنے کے لیے اول الذکر طبقے کے پاس اپنی محنت بیچنی نہ پڑے۔ کسی بھی معاشرے میں استحصال کی روایت ایک مرض ہے جس کے سد باب کے بغیر معاشرہ نہ تو مثالی معاشرہ بن سکتا ہے اور نہ ہی ترقی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنی واضح بات ہے کہ اسے ہر دور میں خواتین کے حقوق کی بازیافت کے لیے کوشاں افراد اور تنظیمیں مختلف پیرائے میں بولتی رہی ہیں۔ لیکن خاطر خواہ تبدیلی کے جو آثار ہمیں نظر بھی آ رہے ہیں ان میں اعتدال نہیں ہے۔ مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کارزارِ کاروبار میں آ جانا ایک بات ہے لیکن وہاں آ کر چیلینجز کو قبول نہ کر کے مردوں کا سہارا تلاش کرنا بالکل دوسری بات۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فرسودگی صرف قدامت کی علامت نہیں بار بار استعمال ہونے والی تشبیہات و استعارات بھی فرسودگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ خواتین اپنے ذہن رسا کا استعمال کر کے فرسودہ روایتوں کی تقلید کو ترک کر کے اپنے گھر سمیت معاشرے میں پھیلی فرسودگی کے تانے بانے کا قلع قمع کریں اور اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالیں جہاں صنفی کشمکش کا سایہ بھی نہ ہو۔

آج ہمارے معاشرے میں جس طرح بے امنی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں جس طرح کرب و اذیت کے شکار ہو کر بھی معاشرے کے افراد سانس لینے پر مجبور ہیں، جس طرح گھروں کا ماحول بدل گیا ہے بچے والدین کی دسترس سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ صارفیت زدہ سماج کے آہنی پنجوں میں جکڑے وہ سائنسی آلات کے مایا جال میں جکڑے جا چکے ہیں وہاں سے اسے باہر صرف اور صرف ماں ہی نکال سکتی ہے۔ اب ان ماؤں پر اس ماحول کو اپنے ڈھب پر لانے کی ذمہ داری زیادہ بڑھ گئی جن ماؤں کا دل ان حالات کو دیکھ کر کڑھتا ہے۔ ان ماؤں کو اس بڑے حملے کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے جو اسکول کے بعد زیادہ تر اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں انھیں اپنی شفقت کے تمام سوتوں کو اپنے نونہالوں کے لیے کھول دینا ہوگا تاکہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کریں۔ بچوں کی پسند و ناپسند میں وہ نہایت خوش اسلوبی سے ان کے نفع اور نقصان کو ملحوظ رکھ کر انھیں راغب کر سکتی ہیں کہ وہ وقتی فائدے کے لیے اپنے طویل کیریئر اور معاشرے کی بنیاد کو کمزور نہ ہونے دیں۔

5 ستمبر کو ہم یومِ اساتذہ مناتے ہیں اساتذہ کسی بھی ملک اور قوم کے معمار ہوتے ہیں اور وہ ہماری اس نسل کی تربیت کرتے ہیں جس نسل کو مستقبل سنبھالنا ہوتا ہے۔ یہ بات ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج ہمارے ملک میں کثیر تعداد ایسی خواتین کی ہے جو اسکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیز تک میں تعلیم و تعلم کے نوبل مشن سے وابستہ ہیں اور نہایت بردباری سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اس موقع پر ہمیں ہندوستان کی پہلی معلمہ ساوتری بھائی پھولے کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جنھوں نے انیسویں صدی میں جب بچیوں پر تعلیم کے تمام راستے بند تھے 1948 میں اسکول قائم کیا اور تادمِ حیات بچیوں کی تعلیم کے لیے عملی میدان میں سرگرم عمل رہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ملک کی تمام خواتین معلمہ کو یومِ اساتذہ مبارک۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

مختار عدیل

عالیہ تبسم

مالیگاؤں کی پہلی اسٹوڈنٹ پائلٹ

مالیگاؤں کے نیا پورہ کی 13ویں گلی میں سکونت پذیر خانوادہ حاجی محمد صدیق (بلیو برڈ) کی ہونہار بیٹی عالیہ تبسم شفیق احمد اسٹوڈنٹ پائلٹ لائسنس (ایس پی ایل) حاصل کرنے والی مالیگاؤں کی پہلی مسلم لڑکی قرار پائی ہے۔ اسی کے ساتھ عالیہ نے اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے دہلی میں تربیتی ادارہ میں داخلہ لیا ہے۔ اس کا خواب ہے کہ وہ کمرشیل پائلٹ کا لائسنس حاصل کرے جو عنقریب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ بلند حوصلوں کی اڑان بھرنے والی عالیہ تبسم کی ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی، اول تا چہارم جماعت تک ارم پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ پانچویں تا دسویں تک مالیگاؤں ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج سے کامیاب کیا۔

انقلاب سے گفتگو کے دوران عالیہ نے کہا کہ 'جب میں ابتدائی جماعتوں میں زیر تعلیم تھی تب اردو اخبارات (شامنامہ، انقلاب) پڑھا کرتی تھی ان اخبارات میں فضائی پروازوں سے متعلق خبریں، تصاویر اور اہم مضامین پڑھنا میرا خصوصی مشغلہ تھا حتیٰ کہ اخبارات میں شائع رنگین اور بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر کو کاٹ کر میں اپنے کمرے کی دیواروں پر چسپاں کیا کرتی تھی۔ میرے اس مشغلے کا علم میرے والدین کو بھی تھا اور یہی جذبہ مجھے ہوائی جہاز اڑانے کی منزل تک لے آیا ہے۔' مزید کہا کہ 'مالیگاؤں کا مسلم معاشرہ بندشوں میں قید تصور کیا جاتا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے یہاں بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بھرپور مواقع دیے جاتے ہیں۔ اپنے بچپن میں میں پڑھا کرتی تھی کہ مالیگاؤں کی پہلی سائنسداں زبیدہ انصاری اور مختلف شعبہ جات میں اولین قرار پانے والوں کی جامع فہرست ہے، بس یہی سوچا کرتی تھی کہ مجھے ہوائی جہاز اڑانا ہے تاکہ اپنے شہر کی پہلی مسلم کمرشیل پائلٹ بنوں۔'

ایوی ایشن کے شعبے میں کیریئر سازی کے متعلق عالیہ تبسم نے کہا کہ ’بارہویں جماعت (سائنس) میں کامیابی کے بعد گریجویشن کے لیے بی ایس سی میں ایڈمیشن لیا اسی دوران پائلٹ بننے کی ٹریننگ کب، کہاں اور کیسے حاصل کی جاتی ہے، اس کی معلومات مکمل طور سے حاصل کر چکی تھی۔ گریجویشن کا آخری سال فی الحال باقی ہے، درمیان ہی میں پائلٹ کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے مدھیہ پردیش فلائنگ کلب (ایم پی ایف سی) میں داخلہ لیا، یہاں پر بارہویں جماعت میں کامیابی کی بنیاد پر ایڈمیشن ملتا ہے۔ 45 دنوں تک زیر تربیت رکھا جاتا ہے اس دوران کلاس ٹو میڈیکل ٹیسٹ اور ایوی ایشن، ایئر کرافٹ ٹیکنیکل، میٹیر ولوجی، نیویگیشن اور ایئر ریگولیشن سے متعلق تحریری پرچے لیے جاتے ہیں اس میں کامیاب امیدوار کو اسٹوڈنٹ پائلٹ لائسنس (ایس پی ایل) تفویض کیا جاتا ہے۔‘ انھوں نے مزید کہا کہ ’ایس پی ایل کی حصولیابی پہلا مرحلہ ہے اس کے ساتھ ہی کمرشیل پائلٹ لائسنس کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے والا پائلٹ کہلاتا ہے جسے سرکاری اور نجی فضائی کمپنیوں میں خدمت انجام دینے کے بہترین مواقع ملتے ہیں۔‘

واضح رہے کہ عالیہ تبسم فی الحال دہلی میں ڈائرکٹر جنرل آف سول ایوی ایشن (ڈی جی ایس اے) کے ذریعے منعقد ہونے والے امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ انشاء اللہ رواں سال کے اخیر مہینوں میں وہ امتحان میں کامیابی کا پرچم لہراتے ہوئے کمرشیل پائلٹ بننے کا ہدف پورا کرلیں گی۔ پائلٹ بننے کے دشوار گزار مراحل کے انتخاب کے متعلق عالیہ تبسم کے والد شفیق احمد نے کہا کہ ’میری زوجہ اور میں نے سفرِ حج کے لیے فضائی پرواز کے دوران سوچا تھا کہ اپنی بیٹی کو پائلٹ بنائیں گے۔ ہم چاہتے تھے کہ بڑی بیٹی پائلٹ بنے لیکن وہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئی تب عالیہ کو اس جانب پیش قدمی کا موقع دیا حالانکہ وہ پہلے سے ہی آسمانوں کی دنیا کی سیر کرنے کی خواہاں تھی جب ہماری طرف سے اسے پروانہ مل گیا تو جیسے اس کی دلی مراد بر آئی۔ عالیہ نے ہماری امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کی تکمیل کے لیے سخت ترین محنت کی ہے۔ صحیح رہنمائی بروقت نہ ملنے سے کچھ پریشانیاں بھی درپیش رہیں جس کا ڈٹ کر مقابلہ اس نے کیا۔ کامیابی ایک دو دن کی محنت سے نہیں برسوں کی ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کم عمری میں پائلٹ بننے کا خواب دیکھنے والی عالیہ اب پائلٹ بن کر خوابوں میں رنگ بھرنے کا مرحلہ طے کرے گی۔‘ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ’اس دشوار کن سفر میں اہلیہ، اہل خانہ اور احباب میں ڈاکٹر لئیق احمد اور عبدالعزیز آزاد میرے لیے ہمہ وقت قدم بہ قدم رہے ہیں۔ جس شہر سے اٹھ کر عالیہ تبسم فضاؤں میں کامیابی کے پرچم لہرا رہی ہے اس شہر کی نیک نامی اور بڑھتی رہے، نئی جہت کے متلاشی نئے آسمانوں کی تلاش میں سرگرداں رہیں اپنا اور اپنے خاندان، قوم اور ملک کا نام روشن کرتے رہیں یہی مقصد حیات اور عالیہ تبسم کا نصب العین بھی ہے۔‘

(بشکریہ روزنامہ انقلاب، ممبئی)

□□□

شاعرات کے منتخب اشعار

ویرانیاں یہاں در و دیوار بن گئیں
پہلے یہی مکان بہت شاندار تھا

الجھے تھے ایسے وقت میں کس آسماں سے ہم
جب سارے شہر میں نہ کوئی پہرے دار تھا

سنیتارینا

کسی کے حسن جہاں تاب کا نکھار ہیں ہم
چمن کا حسن ہیں رنگینی بہار ہیں ہم

بہ ایں کشاکش حرماں بہ ایں غم دوراں
کسی کے چشم کرم کے امیدوار ہیں ہم

صفیہ شمیم

تجدید ملاقات بڑے کام کی نکلی
دیکھا تو جو دوری تھی فقط نام کی نکلی

کچھ ان کا تغافل بھی تھا کچھ اپنا تساہل
اور تھوڑی کسر گردش ایام کی نکلی

سعیدہ عروج مظہر

روشنی کے ہالے میں رقص ہے جنوں پرور
یوں اڑا اڑا لیکن رنگ گلستاں کیوں ہے

پھینکی تو ہیں ہم نے بھی ستاروں پہ کمندیں
پرواز ابھی اپنی لب بام نہیں ہے

زبیدہ تحسین

گاؤں ایسا ہوا شہر لوگو!
کھوج ہے، نہ کوئی خبر لوگو!

آپ بھی اک مکان لے لینا!
بس رہا ہے الگ نگر لوگو!

ڈاکٹر بھاؤنا

میری خودداری مری خوئے انا لے جائے گی
کیا خبر تھی وہ نظر سب کچھ چرا لے جائے گی

وہ میرا وہم نظر تھا کہ تیرا عکس جمیل
وہ کون تھا کہ جو منظر کے درمیان گزرا

شان معراج

گھر سے جو شخص بھی نکلے وہ سنبھل کر نکلے
جانے کس موڑ پر کس ہاتھ میں خنجر نکلے

اب اپنے گھر میں بھی ہیں ہم مسافروں کی طرح
ہر ایک چیز یہاں اجنبی سی لگتی ہے

مسعودہ حیات

صحرا نشیں ہیں آج مگر کل چمن میں ہم
پھولوں کی آبرو تھے ذرا یاد کیجیے

رنگیں ہے جن کے خوں سے فضائے بہار گل
وہ سر فروش ہم تھے ذرا یاد کیجیے

سیما نظمی

عصمت چغتائی کے افسانوں میں مسائلِ نسواں

سفینہ سماوی

انسانی زندگی جذبات و احساسات کے ایسے رنگین دھاگے میں پنہاں ہے کہ اس دھاگے کے مختلف رنگوں کا عکس جب انسانی زندگی کے الگ الگ حصوں پر منعکس ہوتا ہے تو قوس قزح کا وہ خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا ہے جس سے زیست کی روح تک طراوت محسوس کرتی ہے اور اس طراوت سے پیدا ہونے والی شگفتگی اور شادابی انسانی چہروں کو نور عطا کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قوس قزح کے وجود میں آنے کی وجہ ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ جذبات و احساسات کو نا امیدی کے اندھیروں میں کہیں دفن کر دیا جاتا ہے اور شگفتگی اور شادابی مرجھا کر چہروں پر اداسی کی صورت میں نمایاں ہونے لگتی ہے جسے چشم بصیرت سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے انسانی چہروں پر نمایاں اسی اداسی کو اپنی چشم بصیرت کا محور بناتے ہیں۔ یہ اداسی بالخصوص نسوانی کرداروں کی زندگی کا حصہ ہی دکھائی دیتی ہے۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کی زندگی کے مختلف اور متنوع رنگوں سے اپنے افسانوں کی تصویریں کچھ اس طرح سجائی ہیں کہ فطرت انسانی اور وجود زن کی زندگی کا ایک ایک نقش ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا ہر وہ افسانہ جو نسوانی کرداروں پر مرکوز ہے، عورت کی ایسی ایسی داستانوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو قاری کو کبھی جبر و استحصال کا قصہ سناتی ہیں، کبھی خوابوں کے ٹوٹنے کی آوازیں، کہیں مسکراہٹ میں گہری غمگینی دکھائی دیتی ہے تو کہیں قہقہوں میں آنسوؤں کے چھلکنے کی صوت سنائی دیتی ہے۔ کہیں غموں کو چھپائے سنجیدہ چہرے ہیں تو کہیں غمگین آنکھیں اور مسکراتے لب۔ غرضیکہ ان کے افسانے نسوانی زندگی کا وہ مرقع ہیں جس میں منفرد و مختلف النوع تصاویر جلوہ افروز ہیں جو صرف زندگی کی کہانیاں ہی نہیں سناتیں بلکہ زندگی کو جینے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں اور اس کا ہنر بھی۔

عورتوں کے مسائل پیش کرنے والے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو عصمت چغتائی کے افسانے سر فہرست نظر آئیں گے۔ عورتوں کے مسائل ان کے افسانوں کے بنیادی محور ہیں۔ ان کا تانیثی نظریہ دوسروں سے مختلف ہے۔ ان کے افسانے ان کی ذاتی فکر پر مبنی ہیں اور انھوں نے اپنے افسانوں میں ذاتی مشاہدات اور تجربات کو بنیاد بنا کر اپنا تانیثی نظریہ پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے ان موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرنے کی جرأت کی جن پر قلم اٹھانا مردذات کے لئے بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کی اس بیباکانہ حقیقت نگاری کو ہمیشہ ہی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور ان پر فحاشی کے فتوے بھی صادر کئے گئے لیکن انھوں نے اپنے مقصد پر کبھی ان فضول باتوں کی آنچ نہیں آنے دی۔ فنکارانہ خلوص، رشتوں کا احترام، انسان دوستی اور حقیقت کے اظہار کی ہمت جیسے جذبے ان پر ہمیشہ ہی غالب رہے اور انھیں جذبوں کی امین ہونے کی وجہ سے ان کی حقیقت نگاری تلخ اور پیچیدہ ہوگئی۔

عصمت چغتائی کے متعلق اکثر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ ان کے موضوعات گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہتے ہیں لیکن اگر اس چار دیواری کے اندر رہ کر یہاں کے مسئلوں پر عمیق نظر ڈالی جائے تو یقیناً اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ دنیا میں پیدا ہونے والے انسانی زندگی سے جڑے مسائل کی جڑیں انھیں مسئلوں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ چار دیواری کے اندر پیدا ہونے والے مسائل ہی انسانی زندگی کے اہم اور بڑے مسائل کا محرک ہیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے چار دیواری کے اندرونی حالات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔

عصمت کے یہاں عورت کا ہر رنگ موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عصمت صرف عورتوں کی افسانہ نگار ہیں کیونکہ انھوں نے عورتوں کے مسائل پر جس ژرف نگاہی سے غور و فکر کیا ہے اور جس فنی مہارت سے ان کی عقدہ کشائی کی ہے وہ صرف وہی قلمکار کر سکتا ہے جس

نے عورت کی زندگی کے سمندر میں اتر کر ان گہرائیوں کا مشاہدہ کر لیا ہو جہاں تک جانا وجودِ انسانی بالخصوص مرد ذات کے لئے اس حد تک ممکن نہیں ہے جتنا کہ ان مسائل کو پیش کرنا بحیثیت عورت عصمت کے لئے ممکن تھا۔

عصمت کے کئی افسانے ایسے ہیں جس میں انھوں نے عورتوں کی زندگی سے متعلق عام مسائل کو افسانوں میں جگہ دی ہے اور قاری کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چند افسانے ایسے بھی ہیں جو بہت نازک مسئلے پر مبنی ہیں جن پر گفتگو کرنا ہندوستانی معاشرے میں شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے افسانوں میں ''گیندا''، ''لحاف''، ''دو ہاتھ''، ''بھیڑیں''، ''باندی''، ''جوانی''، ''جنازے''، ''چھوٹی آپا'' وغیرہ اہم افسانے ہیں جن میں عصمت نے انسانی زندگی کے ان مسائل کی افسانے کے کینوس پر اس موثر انداز سے تصویر کشی کی ہے جو سنجیدگی، دردمندی اور المناکی کی کہانی کہتا ہے۔

عصمت کے یہاں مختلف النوع موضوعات پر افسانے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں نابالغ بچیوں کا نکاح، کم سنوں کی عصمت دری، جنسی اور ہم جنسی مسائل، غریبی، جوان لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ، امیر زادوں کی عیاشیوں کا شکار معصوم دوشیزائیں، زنا بالجبر، دنیا کی بے رحمی اور سخت دلی، طبقاتی کشمکش اور انسان کی بے حسی جیسے متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے نظریں چرانے کے بجائے ان کو ہمت کے ساتھ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔

عصمت کا افسانہ ''باندی'' نوابوں اور شرفاء کے طبقے کی نام نہاد عزت اور پارسائی کے تمام رازوں کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ جس طرح سے نوابوں اور زمین داروں کی ظاہری زندگی ان کی باطنی زندگی سے متضاد نظر آتی ہے۔ اس کی قلعی اتار کر یہ افسانہ طبقۂ اشرافیہ کی زندگی کا وہ سیاہ منظر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس کو دیکھ کر انسانی روح لرز جائے۔ مذکورہ افسانہ نوابوں کی زندگی کی عیاشیوں، فحش افعال، سفلہ پن، ناجائز تعلقات، باندیوں کے جنسی استحصال، ان کے اسقاط حمل جیسے تلخ حقائق کو پیش کرتا ہے۔ افسانے میں نواب زادوں کی مائیں از خود ان کو برے فعل سے محفوظ رکھنے کے لئے کم سن باندیوں کو آرائش و زیبائش کے ساتھ ان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ نوابوں کی بیگمات اپنے شوہروں کو خوش اور مطمئن رکھنے کے لئے انھیں باندیوں کے شباب اور حسن کا سہارا لیتی ہیں اور خود اپنی جنسی خواہشات دوسرے مردوں کے ذریعہ پوری کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ پورا طبقہ برے افعال کا عادی ہو چکا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ نوابین کے شوق اور بیگمات کے غموں سے قطع نظر ان باندیوں کی زندگیاں تباہی و بربادی کی سیاہ چادروں میں گم ہو جاتی ہیں جنھیں اپنی عصمت کا سودا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ایک عرصے کے بعد جب ان کا حسن و شباب اپنی آب و تاب کھو دیتا ہے تو نہ ہی کوئی مردان کا سہارا بنتا ہے اور نہ ہی ان کی زندگی میں بہاریں دستک دیتی ہیں نتیجتاً ان کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔

ایک طبقہ اپنے مفاد کے لئے جس طریقے سے دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے وہ اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ عورت کی مجبوریاں اور محرومیاں دونوں وجودِ زن کے لئے ناسور ہیں۔ چاہے وہ نوابین کی بیگمات ہوں یا باندیاں ہوں، دونوں مختلف سطح پر جنسی، نفسیاتی اور معاشرتی جبر و استحصال سے محفوظ نہیں رہ پاتیں۔ افسانہ ''گیندا'' اور ''پہلی لڑکی'' بھی اسی سلسلے سے منسلک افسانوں میں شامل ہیں۔ افسانہ ''گیندا'' 14-13 سال کی چھوٹی بچی جو کہ بیوہ ہے، اس کے جنسی استحصال اور حاملہ ہونے کے بعد اس پر ہونے والے مظالم اور جبر و تشدد کی داستان ہے۔ ایک طرف شرفاء کے صاحبزادوں کی غیر شریفانہ حرکات ہیں جن کی پردہ پوشی کی جاتی ہے تو دوسری طرف کم سن لڑکی کو بدکردار بتایا جاتا ہے۔ یہ افسانہ طبقاتی کشمکش اور دو طبقوں کے درمیان زبردست تصادم (Conflict) کو پیش کرتا ہے۔ گیندا ایک معصوم بچی ہے اور جس طرح اس کی ناسمجھی کا فائدہ اٹھا کر اس کے ساتھ تشویش ناک رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ قابل مذمت ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو مہذب ہونے کے دعویدار ہونے کے باوجود گیندا کے ساتھ حیوانی سلوک کرتے ہیں اور دوسری جانب گیندا ہے جو بدذات ہونے کے باوجود اپنے اس بچے کے لئے ممتا کا جذبہ رکھتی ہے جس کے وجود نے اسے نہ جانے کتنے مظالم کا نوالہ بنایا۔ معصوم سی بچی ماں بننے کے بعد کیسے ایک دم سے ذمہ دار عورت بن جاتی ہے اس کی مثال افسانہ ''گیندا'' سے ملاحظہ فرمائیں:

''وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟....''

''تم انھیں چٹھی لکھوگی۔ کیوں بی بی؟....''

''اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لئے اب کے لال بنیائن لائیں، جیسی بسنتی کا چھورا پہنے ہے....''

''اور.... یہ کہ......'' اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب کی بار چھٹیوں میں دو چار دن کے لئے ضرور آنا'' جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو۔ اور ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی۔''

درد و کرب میں ڈوبا یہ مکالمہ بلاشبہ دردمند دلوں کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہے اور عصمت کے فن کا یہی خاصہ ہے۔

عصمت نے عورت ذات کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو

پیش کرنے کی سعی تو کی ہے ساتھ ہی اس کے محرکات بھی ان کے منظور نظر ہیں جس کی وجہ سے یہ حادثات پیش آتے ہیں۔ مذکورہ افسانہ کئی مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مثلاً نابالغ بچیوں کی شادی، بیوہ کی ناقدری، دوسری شادی کا معیوب سمجھا جانا، لڑکوں کی پرورش میں بے توجہی وغیرہ ایسے نازک مسائل ہیں جن کی طرف عصمت نے اشارہ کیا ہے۔

افسانہ ''لحاف'' جنس کے موضوع پر لکھا بہت ہی نازک اور اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے کے متعلق اب تک جو باتیں سامنے آئیں ہیں اس کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ افسانہ ''لحاف'' Lesbianism کے موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن جدید جنسی Terms کے مطابق یہ افسانہ Lesbianism کے موضوع پر مبنی نہیں ہے۔ Lesbian کے معنی ہوئے وہ عورت جو کسی دوسری عورت سے آپس میں جنسی تعلق رکھنے کی متمنی ہے اور یہی رشتہ اس کو فطری معلوم ہوتا ہے جبکہ بیگم جان Lesbian نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے نواب صاحب کے لئے سجتی سنورتی ہے پھر جب نواب صاحب اس کی طرف راغب نہیں ہوتے تو وہ نیاز دلاتی، منتیں مانگتی، وظیفے پڑھتی اور چلّے باندھتی لیکن جب ان سب حربوں سے اس کا مسئلہ حل نہ ہوا تو اس کی ملازمہ ربّو اس کی مشکل حل کر دیتی ہے اور وہ جسمانی خواہشات کی تسکین کے لئے غیر فطری جنسی عمل کی جانب attract ہو جاتی ہے۔ جبکہ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جنسی خواہش مرد سے ہی تسکین پا سکتی تھی لیکن عورت کے ساتھ یہ غیر فطری جنسی عمل اس کی اس مجبوری کا حصہ ہے جس کا سبب نواب صاحب ہیں اور جس عمل کو جدید جنسی Terms میں Bisexuality کہا جاتا ہے۔ یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ نواب صاحب ہم جنس (Gay) ہیں لیکن اس جانب لوگوں نے توجہ دینے کے بجائے بیگم جان کے جنسی عمل پر زیادہ توجہ مرکوز کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بیگم جان کا جنسی عمل افسانے میں واضح ہے نہ کہ نواب صاحب کا۔ لیکن عصمت کی ژرف نگاری اور غور و فکر اس بات کی جانب توجہ دلاتی ہے کہ عورت کے Sexual right کا تحفظ بھی مرد کے ہاتھ میں ہی ہے اور جب مرد اس کا یہ حق نہیں دیتا تو وہ جنسی بے راہ روی کے راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ افسانہ عصمت کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی یہی وجہ ہے کہ عصمت نے Lesbianism کو موضوع نہیں بنایا ہے کیونکہ Lesbianism جنسی term ہے اور یہ قدرتی اور فطری جبلت ہے لیکن بیگم جان سے جس قسم کا جنسی عمل سرزد ہو رہا ہے وہ ایک غیر فطری جنسی عمل ہے کیونکہ وہ نارمل عورت ہونے کے بعد بھی جنسی تسکین کے لئے جس طریقے کا سہارا لینے پر مجبور ہے اس بنا پر بیگم جان کو کم از کم Lesbian نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انھیں Bisexual کے نام سے موسوم کیا جائے جو عورت اور مرد دونوں جنس کی جانب یکساں راغب ہوتے ہیں۔ لیکن مذکورہ افسانے میں بیگم جان کے تعلق سے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ Bisexual ہیں کیونکہ اس افسانے کی Theme ہی غیر فطری جنسی عمل پر ٹکی ہوئی ہے اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ بیگم جان نارمل عورت ہونے پر بھی جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے کیوں غلط طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہے؟ عورت ذات کے جنسی حقوق کی پامالی ہی افسانے کا مرکزی خیال ہے جو اس افسانے کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اور جس کی جانب عصمت نے توجہ دلانے میں پہل کی ہے۔

افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ہمارے معاشرے کا وہ المیہ ہے، جس کی وجہ سے نہ جانے کتنی جوان لڑکیوں کی جوانی اس طرح کمھلا گئی جس طرح بنا پانی کے پودے۔ چمکتی، مچلتی، اچھلتی، کودتی، دریا کی لہروں کی مانند بل کھاتی، غوطے لگاتی، ہنستی کھلکھلاتی جوانی آخر کیوں رفتہ رفتہ اُداسی اور غمگینی کی اندھیرے کنوئیں میں کہیں جا چھپتی ہے، اس کا جواب نام نہاد اخلاقی معاشرے کے سرپرست ٹھیکیداروں کے پاس موجود نہیں ہے۔ کبریٰ کی جوانی بھی دھیرے دھیرے انھیں اندھیروں کی آغوش میں چلی جا رہی تھی جہاں روشنی کا کوئی امکان نہ تھا۔ ایک بہن کی اپنی بڑی بہن سے محبت اور اس کی خاطر اپنی عزت کی قربانی اور عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر بھی صبر سے کام لیتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا عورت کی عظمت کا ثبوت ہے۔ اور دوسری طرف راحت جیسے کم ظرف مرد ہیں جو عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غربت میں ان کے ٹمٹماتے چراغوں کی لو بھی مسل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ افسانہ جہاں ایک طرف جہیز جیسے مسئلے کو موضوع سخن تو بناتا ہی ہے ساتھ ہی ایک عورت کی محبت، عظمت اور ایثار و قربانی کا جذبہ بھی بروئے کار لاتا ہے۔ جہاں ظلم و ستم کو برداشت کرنے کی طاقت تو ہے لیکن اس کا کوئی نفع نہیں کیونکہ عورت کی کم عقلی اور ادنیٰ سمجھ نے اس کو اس نقصان کا حصہ دار بنایا ہے۔ عصمت نے اس افسانے میں ان عوامل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو ان حادثات کے وجود میں آنے کے اسباب بنتے ہیں بلاشبہ حادثہ ہونے کے بعد انھیں درست نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کا شکار ہونے سے قبل خود کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کے متعلق جگدیش چندر ودھاون رقم طراز ہیں:

> ''یہ لاکھوں گھروں کا المیہ ہے جہاں جوان لڑکیاں اپنے والدین کی غربت اور عسرت کے سبب دل ہی دل میں اپنے مقدر کو روتی کوستی اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ غربت اور جہیز کے مسائل والدین کے حوصلے پست کر دیتے ہیں اور

وہ حالات کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ عصمت کی درد مندی اور گداز دلی اس افسانے کے ہر لفظ سے چھلکی پڑتی ہے۔ انھوں نے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سجھایا اور بطور ایک فنکار یہ شاید ان کے منصب کا تقاضا بھی نہیں تھا۔ ان کا کام صرف شیشہ دکھانا تھا، سو دکھا دیا، حالات کی عکاسی کرنی تھی سو کر دی۔ اور بہ حسن و خوبی کی۔''

(عصمت چغتائی شخصیت اور فن: جگدیش چندر ودھاون: صفحہ: 213)

افسانہ ''بھیڑیں'' عصمت کا مسائل نسواں کے موضوع پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے جس میں انھوں نے غربت کی وجہ سے بچیوں کو فروخت کرنے کا قصہ پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار میگی نام کی ایک نچلے طبقے کی عیسائی لڑکی ہے جس کو اس کے والدین نے کام پر لگا دیا ہے اور وہ شہر ممبئی میں مقیم ہے جہاں کام کر کے پیسہ جمع کرتی ہے تاکہ اپنے لئے ایک دولہے کا انتظام کر سکے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے ماما بن کر رہنا پڑے گا جو ساری عمر کنواری رہ کر دوسروں کے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ لیکن عین شادی سے قبل اس کے دولہے کی ایک حادثے میں موت ہو جاتی ہے جو میگی کے لئے بہت بڑا غم ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے مرد سے شادی کرتی ہے جہاں اس کو غربت کی وجہ سے اسقاط حمل جیسے ناجائز کام کو انجام دینا پڑتا ہے کیونکہ اس کے پاس بچے کے لئے نہ تو وقت ہے اور نہ پیسہ۔ عصمت نے اس روح فرسا حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں عورت کو کس حد تک ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے کہ والدین سے لے کر شوہر اور شوہر سے لے کر افراد سماج کوئی بھی اس کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہے۔

عصمت چغتائی عورتوں کی نبض شناس ہیں۔ عورتوں کے نرم و نازک جذبات، جنسی خواہشات، اس کے مزاج کی نرمی، لطافت، شوخی اور بانکپن ان کے افسانوں میں ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ عصمت کے نسوانی کردار زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جو کسی نہ کسی قسم کے جبر و استحصال کا شکار ہیں۔ ان کو ہر عمر و طبقے کی خواتین کی اندرونی زندگی پیش کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے اور اس کی اہم وجہ بھی شاید یہی ہے کہ وہ خود ایک عورت ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے جتنے بھی روپ ہو سکتے ہیں، ان سب کا بغور جائزہ لیا ہے تب اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی اسی خاصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں کہ:

''عصمت اگر عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں ''بھول بھلیاں''، ''تل''، ''لحاف''، ''گیندا'' جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں، صاف شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک یہ ادائیں وہ عشوے اور غمزے نہیں ہیں جن کو تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی انجانی، ان بوجھی مگر مخملیں فطرت سے بغل گیر ہوئے ہیں۔''

عصمت کے بیشتر افسانے ان نازک مسائل پر لکھے گئے ہیں جو صحت مند معاشرے کی تشکیل میں کاری ضرب لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلے ہی ان مسائل کی طرف عام قاری کی توجہ نہ جاتی ہو یا اگر کوئی حساس فرد ان پر غور و فکر کرتا بھی ہو تو سرسری طور پر ان مسائل کو لیتا ہوگا لیکن عصمت نے ان مسائل کی گہرائی تک قاری کی توجہ مبذول کرانے کی سعی کی ہے۔ معاشرے کے تمام مسائل کے لئے ان کی فکر مندی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ انھیں اپنے معاشرے، اس کے افراد بالخصوص عورت کی زندگی سے کس قدر لگاؤ تھا۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عصمت ایک دم سے سب کچھ ٹھیک کر دینا چاہتی ہیں اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے کی طرف قاری کی توجہ منعطف کرنا ان کا صالح مقصد ہے تاکہ ایک صحت مند سماج کا وجود قائم ہو سکے۔

تمہ تحریر کے طور پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ عصمت ایسی فنکارہ ہیں جن کے یہاں موضوعات کی سطح پر علمیت اور عمیق نگاہی کا تو ثبوت ملتا ہی ہے ساتھ ہی ان کی تخلیقی ریاضت نے واقعات اور کرداروں کو متنوع سطح پر دیکھا اور بیان کیا ہے۔ عصمت نے سماجی، سیاسی اور معاشی استحصال کی طرح جنسی استحصال کے خلاف خاص طور پر صدائیں بلند کیں۔ ان کی انسانی ہمدردی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مذہب و اخلاق اور فرسودہ روایات کو منہدم کیا اور زندگی کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر کھلے آسمان میں آزادی کی سانس لینے کی طرف ایک کامیاب پیش قدمی کی۔ ان کی افسانوی کائنات کا مطالعہ کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی کینوس بہت وسیع تھا جس میں معاشرے کے ہر فرد کے مسائل کو سمونے کی گنجائش تھی اور اسی وسیع النظری کی بنیاد پر عصمت اردو فکشن میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ☐☐☐

Safina Samavi
Research Scholar, Deptt. of Urdu
University of Allahabad-211002 (U.P)

مسرت فردوس

میڈیا اور اردو زبان

آج دنیا کی ہمہ جہت ترقی میں سب سے اہم حصہ ذرائع ابلاغ کا ہے۔ میڈیا نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے ہر پہلو سماجی، معاشی، تجارتی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ میڈیا نے زندگی کو نئے آفاق اور نئے جہانوں سے متعارف کروایا ہے۔

یوں تو میڈیا کی کئی جہتیں ہیں لیکن اسے دو واضح جہتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک پرنٹ میڈیا یا مطبوعہ صحافت دوسرے الیکٹرونک یا برقی صحافت یا میڈیا۔

پرنٹ میڈیا میں روزنامے، ہفت روز اخبار، علمی و ادبی مجلّے، پیشہ وارانہ رسالے، سہ ماہی اور سالانہ جریدے شامل ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلمی کمپیوٹر، انٹرنیٹ، برقی یا الیکٹرونک میڈیا ہیں۔

ہندوستانی صحافت کے میدان میں آج اردو اخبارات کی تعداد اشاعت کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر شمار کیے جاتے ہیں۔ ملک بھر سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے۔ان میں 150 سے زیادہ روزنامے اور تقریباً 700 ہفتہ وار شامل ہیں اور اس کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو اخبار تقریباً دوسو سال کی طویل مسافت طے کر چکے ہیں اور ہندوستانی سماج کی تعمیر و ترقی میں اپنا اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران بھی دیگر زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں اردو اخبارات سب سے آگے رہے۔اخبارات نے ذہن جدید کی تعمیر و تشکیل میں انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کی ترویج میں دانشوروں، عالموں، اساتذہ اور سماجی کارکنوں کا اہم رول رہا ہے۔اردو کے صحافیوں نے خلوص، محنت اور خون جگر سے اردو صحافت کی آبیاری کی۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے شہید ہونے والا پہلا صحافی اردو کا ہی تھا۔ ہاتھ کی کتابت اور پتھر پر لیتھو، سست رفتار چھپائی کے تاریک دور سے گزرتی ہوئے آج اردو صحافت اور طباعت کلر آفسیٹ چھپائی اور کمپیوٹر کتابت کمپوزنگ کے دور میں دوسری زبانوں سے قدم سے قدم ملا کر تو نہیں لیکن تعاقب کرتی ہوئی اکیسویں صدی میں داخل ہوگئی ہے۔کمپیوٹر کتابت اور اردو نیوز سروس، اردو پریس کے لیے بڑا سہارا ثابت ہوئی۔ اردو پریس کا بڑا طبقہ اقتصادی بحران کا شکار ہے۔

اردو اخبارات میں بعض کثیر الاشاعت روز ناموں اور ہفتہ وار اخباروں کو معیاری صحافت کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔اکثر اہم روزنامے اور ہفتہ وار ملک کے بڑے شہروں ممبئی، کلکتہ، دہلی، حیدر آباد، بنگلور اور سری نگر سے شائع کیے جاتے ہیں۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی اور ہندوستان کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے اردو اخبارات بہت پیچھے ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔صرف چند اخبارات کو چھوڑ کر باقی اخبارات اپنے محدود وسائل اور روایتی انداز کی سوچ اور فکر سے آگے بڑھنے میں ناکام رہے۔

پچھلے پچاس برسوں میں اخبارات و رسائل کی تعداد و مالیات میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔اردو اخبارات سے منسلک عملہ نئی تکنیک اور نئے تجربوں کو اپنانے کے بجائے پرانی ڈگر پر چلنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ اخباروں میں احتجاجی رویہ اختیار کیا جاتا ہے یا اشتعال انگیز بیان شائع ہوتے ہیں۔

باشعور، ذی علم مدیر، صاحب طرز کالم نویس اور مستعد اخبار نویس کی عدم دستیابی کی وجہ سے اخبار کے اداریوں میں وہ قوت اور اثر باقی نہیں رہا اور اب صحافیوں کے اخلاقیات میں زوال آ چکا ہے۔ تبصرے و تجربے حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان میں مصلحت کا رنگ شامل ہوتا ہے۔ نگارش، ادارت، طباعت، تجارت، تقسیم اور فروخت کے مابین نظام ہونا ضروری ہے۔

شمیم طارق آزادی کے بعد اردو صحافت میں لکھتے ہیں کہ آج بھی ہر صبح ملک کے کم از کم 14 لاکھ 38 ہزار افراد کے ہاتھوں میں اردو کا کوئی نہ کوئی روز نامہ ضرور ہوتا ہے۔ ملک کی تقریباً دس ریاستوں میں اردو کے ایسے روزنامے شائع ہوتے ہیں جو ملک کی کسی بھی زبان کے صف اول کے اخبار سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ کئی مسائل کے باوجود اردو صحافت کی اشاعت کے ختم ہونے یا کم ہونے کی شکایت کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو بڑھانے کی فکری اور عملی تدابیر اختیار کی جائے۔ اردو قارئین اور اردو صحافیوں کی توجہ سے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن الیکٹرانک عوامی ترسیل کے ذرائع ہیں۔ آج عالمی بازار میں ان ذرائع کا بول بالا ہے اور اب ہندوستانی گھروں میں کمپیوٹر world wide web (WWW) (Internet) کا چلن بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ Cyber cafe بھی ہوٹل اور ریستوران کی طرح عام ہو رہے ہیں۔

ہندوستان کا سب سے قدیم الیکٹرانک ماس میڈیا فلم اور ریڈیو نے پچھلی صدی میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ فلم نے ایک نجی صنعت کے طور پر، ریڈیو نے سرکاری محکمہ کے طور پر یکم جنوری 1936 کو آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد دہلی میں پڑی۔ اس کے بعد لاہور، پشاور، بمبئی، لکھنؤ، کلکتہ، مدراس اور ترچنا پلی میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے۔ دوسرے جنگ عظیم کے بعد ریڈیو کی ریڈیو سے منسلک ہو گئے تھے۔ پطرس بخاری اور ذو الفقار علی بخاری کے علاوہ نمایاں نام کرشن چندر، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، میرا جی، مختار صدیقی، مجاز، ن م راشد، عشرت رحمانی، پروفیسر مسعود حسین خان، لالہ مہیشور دیال، اعجاز بٹالوی، اختر الایمان، بہزاد لکھنوی، سلطانہ بیگم، پریم ناتھ، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش وغیرہ شامل تھے۔ آزادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو وزارات اطلاعات ونشریات کے ایک محکمے کے طور پر کام کرتا رہا مگر ریڈیو کشمیر سری نگر کے استثنیٰ کے ساتھ کہیں بھی نشریات کی زبان اردو نہیں رہی۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اطلاعات ونشریات سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی پارلیمانی تقریر میں اردو کی شمولیت کی برابر حمایت کی تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ اپنے External services ڈیویژن (ESD) میں شارٹ ویو پر اردو نشریات کا بے حد موثر شعبہ کھولا۔ اردو سامعین کو اس سے بڑی راحت اور تقویت پہنچی۔ اردو سروس نے اپنی تبصراتی اور دیگر نشریات میں اردو کے مشاہیر ادب اور صحافیوں کی خدمات حاصل کیں۔ ملک میں سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ لسانی پالیسی میں بھی تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے ملک کے کئی صوبوں میں جہاں اردو آبادیاں قابل لحاظ تھیں وہاں سے اردو پروگرام کی نشریات شروع ہوئیں۔ بڑے بڑے مراکز سے اردو خبروں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ڈائرکٹوریٹ جنرل آل انڈیا ریڈیو کے 9 اگست 1989 کے خط میں ملک کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے اردو پروگراموں کی فہرست درج ہے۔ یہ فہرست کافی حوصلہ بخش ہے۔ ملک کے 36 ریڈیو اسٹیشنوں سے کہیں روزانہ، کہیں ہفتہ میں دو بار اور کہیں ہفتہ وار ایک گھنٹہ، 55 منٹ، چالیس منٹ، 30 منٹ کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ بیس مقامات سے اردو خبریں ریلے ہوتے ہیں۔ ریڈیو تقاریر، ڈرامے اور انٹرویوز کی فہرست بھی بڑی توانا اور معیاری ہے۔ ملک کے ہر علاقے کے اردو شاعر و ادیب ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اعلیٰ درجے کا تخلیقی ادب ریڈیو سے نشر ہوا۔ صرف ریڈیو اردو ڈرامے ہی اردو ادب کا ایک بڑا حصہ ہے۔ ان سب کے علاوہ electronic profssionalism کی کمی اور نامہ نگاروں و صحافیوں کو مستقل ملازمتیں نہ دی جانے کی وجہ سے کئی دشواریاں اور معیار میں گراوٹ آئی ہے۔

آج کا دور ذرائع ابلاغ کا دھماکہ خیز دور ہے جس میں عام زندگی اور انسانی معاشرے کے طرز عمل اور اس کے طرز اظہار پر ماس میڈیا کی گرفت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور رہنما حیثیت کی حامل ہو گئی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، کیبل، نیٹ ورک، ہوم ویڈیو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ نے دنیا میں اطلاعات اور نشریات کا ایک جال بچھا دیا ہے اور وسیع و عریض دنیا گھر آنگن بن گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اردو کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو زبان کی قوت، اس کی ہمہ گیری، گیرائی و گہرائی، اشاریت و بلاغت، شیرینی و حسن ہر جگہ کام آتی ہے۔

پچھلے چالیس برسوں سے ٹی وی نیٹ ورک بڑی سرعت سے وسعت پذیر رہی ہے۔ دور درشن کی terresterial telecast ملک کی 99 فیصد آبادی تک پہنچ گئی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر

جنرل کے ہی زیر اہتمام 1965 میں ٹیلی ویژن پروگرام شروع ہوئے تو گویا ثقافت کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آ گیا۔ دور درشن کے پروگرام میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت، ادب، موسیقی مختلف علاقوں میں اپنی شان دکھاتا ہوا رنگا رنگ کلچر پیش کیا گیا۔ چند سالوں بعد آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے شعبے الگ الگ ہو گئے۔ ریڈیو کی طرح بہت دنوں تک ٹی وی نشریات بھی حکومت کی اجارہ داری میں رہی اور شاید سری نگر کو چھوڑ کر کہیں بھی نشریات کی زبان اردو نہیں تھی مگر سیاسی اور عوامی دباؤ سے جن جن صوبوں میں اردو کی کثیر آبادیاں تھیں وہاں دور درشن کے بڑے مراکز سے اردو نیوز ٹیلی کاسٹ کی شروعات کی گئی۔

بے شمار ٹیلی ویژن چینلوں میں صرف ایک ای ٹی وی نام کا ہمہ وقتی چینل ہے۔ اس چینل کے سلسلے میں کوئی ایسی فیڈ بیک سروے بھی نہیں ہے کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ چینل اردو بولنے والے سماج کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرنے کی اپنے اندر سکت پیدا کر سکا ہے۔ دور درشن کا اردو چینل زینت بھی ہے۔

ٹیلی ویژن سے وابستہ فنکار یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو میں دوسری علاقائی زبانوں کے مقابلے میں میڈیا کی زبان بننے کی صلاحیت اور خوبی کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے غیر اردو چینل بڑی جرأت، حکمت عملی سے اپنے پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ اردو زبان استعمال کر رہے ہیں۔ اردو تفریح، خبر، معلومات کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہی ہے اور وہ کامیابی سے ہمکنار ہیں۔ ذرائع ابلاغ زبان کو ایک اوزار کے طور پر استعمال کرنے میں یقین رکھتے ہیں اور وہ خبر اور اطلاع کی ترسیل میں زبان کو بطور وسیلہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے وہی زبان قابل قبول بنتی ہے جو کسی بھی چینل کے مطلوبہ ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ترسیلی طاقت رکھتی ہے۔ اس لیے اردو برصغیر کے عوامی ترسیل اور ابلاغ کے مختلف میڈیم میں ایک زندہ اور فعال زبان کے طور پر تیزی سے اپنا لی گئی ہے۔ بصورت حال خبروں سے لے کر سیریل اور مختلف نوعیت کے دوسرے پروگراموں کے سلسلے میں ایسے ہی رویے کی حامل ہے۔ ٹیلی ویژن کی مقبولیت کے موجودہ دور میں اشتہارات کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اشتہارات کے لیے اختصار اور جامعیت لازمی ہے۔ اردو ایک ایسی جامع زبان ہے کہ اختصار اور تاثر پذیری اس کی ذاتی خصوصیات ہیں اور یہ تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے ہی رابطہ کی زبان ہے۔ جامعیت اور اختصار کے لیے اردو زبان موزوں ترین ہے، اس لیے ٹیلی ویژن کے اشتہارات میں 90 فیصد الفاظ اردو کے ہوتے ہیں۔ اشتہارات لکھنے اور فلمانے والے سب ہی ماہرین اردو سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ انگریزی اور علاقائی زبانوں کے علاوہ جتنے پروگرام بھی ٹیلی ویژن پر دکھائے جاتے ہیں انھیں چاہے کسی وجہ سے عنوان کچھ بھی دیا جاتا ہو، ان سب میں اردو زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود اس زبان کا اثر و رسوخ عوامی زندگی میں نہ صرف قائم ہے بلکہ بڑھ رہا ہے اور جب سے کئی پرائیویٹ چینل شروع ہوئے تب سے بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ دنیا الیکٹرانک میڈیم کے ذریعہ ایسے نقطہ پر سمٹ آئی ہے کہ ایک ملک کی نشریات سٹیلائٹ کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں عام طور پر دیکھی جاتی ہیں اور اردو کا مسئلہ، اس کا دائرہ کار اس کی مقبولیت اب صرف اس برصغیر تک محدود نہیں ہے بلکہ کم و بیش پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اب اردو بین الاقوامی زبان بن گئی ہے۔ اردو شعر و ادب کا پراثر استعمال ہو رہا ہے۔ کون سا مقبول سیریل ایسا ہے جس میں اردو کے مکالمے نہ ہوں، کتنے ہی سیریل میں اردو شاعری کا باقاعدہ استعمال ہوا ہے اور شاید ہی کسی مقبول سیریل کا ٹائٹل سونگ ایسا ہو جس نے اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کی صنف سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

سیریل ہو یا ڈرامہ، مباحثہ ہو یا خبریں، دستاویزی فلم ہو یا چند سکنڈ کا اناؤنسمنٹ وغیرہ ہر پروگرام کے لیے اردو زبان کی ضرورت ناگزیر ہے اور الفاظ کی معانی، ان کے اتار چڑھاؤ اور ان کے پس منظر سے کما حقہ واقفیت کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا، اس لیے تکنیکی افراد کے لیے بھی اردو زبان کا جاننا ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے اس میڈیم کے تکنیکی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کر کے زبان کا تخلیقی استعمال کرنے کی کوشش کریں اور غیر اردو داں تکنیکی افراد اردو زبان سے واقفیت حاصل کریں تاکہ وہ اپنا کام زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دے سکیں۔ اردو ٹیلی ویژن کی مقبول زبان تو ہے لیکن دور درشن میں اردو کے کوالیفائیڈ جرنلسٹ، نامہ نگار، کمپیوٹر گرافکس، اردو ریفرنس آفیسر اور باضابطہ نیوز روم کی خدمات سے یکسر محروم ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری نے جو غیر محسوس طور پر اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اس نے اردو زبان اور کلچر کو ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں زندہ اور محفوظ رکھا۔ اگرچہ فلمیں ہندی کے نام پر ریلیز ہو رہی ہیں مگر ان کا ٹائٹل اور Spoken 90

language فیصد اردو ہے۔ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور اس کو تیسرے درجے میں پہنچانے میں بہت بڑا ہاتھ فلموں کا کام ہے۔ ہماری فلموں کا اردو زبان سے ایک اٹوٹ رشتہ رہا ہے۔ جس زمانہ میں تھیٹر ہی تفریح کا ایک بہترین ذریعہ تھا اس وقت اردو کے مشہور شاعر، ادیب، تھیٹریکل کمپنیوں سے وابستہ تھے اور وہ بالعموم 'منشی' کہلاتے تھے۔ فلموں کے گیت، مکالمے، منظر نامے اور کہانی لکھنے والے ہمیشہ اردو کے ادیب اور شاعر رہے ہیں۔ ضرورت اور سچویشن کے تقاضوں کے تحت اردو اساتذہ کا کلام فلموں میں لیا گیا۔ فلموں سے متعلق غیر اردو داں حضرات نے با قاعدہ اردو سیکھی اور اپنے فن اور مکالموں کو خوب سے خوب تر پیش کیا۔ آغا حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی، منشی پریم چند، پنڈت سدرشن، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، مجروح سلطان پوری، جان نثار اختر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، راجہ مہدی، علی خان وغیرہ فلموں میں اردو کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

فلموں کی تشہیر، فلموں پر تبصرے، فلموں کی خبروں کے لیے اردو میں معیاری فلمی اخبار و رسائل شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ 'شمع' نئی دہلی، ماہنامہ 'روبی'، 'چترا'، ویکلی 'کہکشاں' بمبئی، 'رنگ برنگ' حیدر آباد، 'فلم' ویکلی کلکتہ' فلموں کے بہترین اردو اخبارات رسائل ہیں۔ غرض یہ کہ فلم اور اردو لازم و ملزوم ہیں لیکن فلم سنسر بورڈ کی طرف سے انھیں ہندی زبان کا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فلموں کی کامیابی میں اردو زبان کا زبردست رول ہے۔ اردو اپنی ترسیلی طاقت اور صلاحیت کی بنا پر قومی سطح پر ثقافت کے مرکزی دھارے میں اپنا رول ادا کر رہی ہے۔ اردو کو نئے ذرائع ابلاغ سے ہم آہنگ ہونے اور ان کے پیشہ ورانہ تقاضوں کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔ ہماری consumer society میں زبان و ادب اور کلچر سب منافع بازار کے رہین ہیں۔ ٹیلی ویژن چینل میں مسابقتی دوڑ لگی ہے اور ان میں تجارتی پہلو بڑا اہم ہے۔ اگر کوئی زبان نئی ٹکنالوجی کے ساتھ نہیں چلتی تو وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اردو اور اردو صحافت کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا وقت کا تقاضا ہے۔

Dr. Masarrat Firdaus
Associate Prof., Head Dept. of Urdu
Dr. Baba Saheb Ambedkar Marhatwada
Univiersity, Aurangabad (M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

براتِ عاشقاں برشاخِ آہو۔ ف۔ ضرب المثل (×) یہ فارسی زبان کی ضرب المثل ہے۔ جو وہاں تین طرح سے بولی جاتی ہے۔ اول طرح تو یہی ہے جو اوپر لکھی گئی۔ دوسری۔ تیسری حسب ذیل ہے۔ یعنی برات بر یخ و برات بسوئے یخ۔ اسے عدم وثوق۔ بے ثباتی۔ ناامیدی۔ نامرادی لاحاصل و بے سود کے موقع پر بولتے ہیں

بنوعِ خوشدلی ہمہ کردہ از عالم کہ پنداری
بطِ مینا نے ے برشاخ آہو آشیاں دارد (تاثیر)

(×) جھوٹ بولنے اور جھوٹا وعدہ کرنے پر بھی وہاں اسکا اطلاق ہوتا ہے
(چونکہ ہرن ایک چنچل۔ اچپل بے چین۔ مضطرب المزاج اور نچلا نہ رہنے والا جانور ہے۔ جس سے اسکے سینگ پر بھی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ اس وجہ سے عدم حصول مراد اور وعدہ دروغ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ عدم استقلال و عدم استحکام سے بھی مراد لی جاتی ہے چنانچہ استاد ذوق نے بھی اس مثل کو اردو شعر میں باندھا ہے اور اثنائے گفتگو میں بھی بطریق تمثیل یہ کہاوت زبان پر آجاتی ہے حضرت ذوق کا شعر ہے

سوالِ بوسہ کو ٹالا جواب چینِ ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخِ آہواس کو کہتے ہیں (ذوق)

یعنی ہم نے جو اپنے محبوب سے بوسہ کا سوال کیا تو اس نے تیوری چڑھا کر اور چیں بجبیں ہو کر ظاہر کر دیا کہ تمہاری یہ مراد بر آنے والی نہیں ہے ہم سے ایسی توقع نہ رکھئے۔ پس شاعر یہ کہتا ہے کہ ہمارے حق میں یہ جواب ایسا ملا کہ جسے ''براتِ عاشقاں برشاخ آہو'' پر محمول کر سکتے ہیں گویا ہماری یہ درخواست لاحاصل بے سودا اور فضول ٹھہری۔

مسلسل کاوشوں سے ہی بنا کرتی ہیں تقدیریں

سید نوشاد بیگم محمود

گھر، اسکول اور سماج ان تین مقامات پر بچے نشوونما پاتے ہیں۔ ان تینوں مقامات پر بچوں کو عمدہ زندگی جینا سکھانے کی کاوشیں ہونی چاہیے، یہ سمجھ اور شعور سرپرست، اساتذہ اور معاشرے کے رہنماؤں میں ہونا چاہیے۔

دورِ حاضر کے والدین کے سامنے ایک سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا پھر بھی بچوں کو کوالٹی ٹائم کیسے دیں؟۔ درحقیقت یہ چھوٹے بچوں کے والدین یا سرپرست کی جانب سے دریافت کیا گیا نہایت ہی دیانت دارانہ سوال ہوتا ہے۔ ان سرپرستوں کو مزید ایک فکر لاحق ہوتی ہے کہ ہمیں سپورٹ سسٹم میسر نہیں ہے۔

اب سپورٹ سسٹم باقی نہیں رہا کیونکہ مشترکہ خاندان نہیں رہا۔ خود مختار خواتین خاندان میں خواتین کی کھینچا تانی میں اضافہ ہو گیا۔ دوم یہ کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ملازمت کے لیے گھر سے باہر قدم رکھ رہی ہیں لیکن اب تک مرد حضرات کی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ زیادہ تر کاموں کا بوجھ عورتوں کے کندھوں پر ہی ہے۔ جیسے بچوں کی پرورش کرنا، گھر کے انتظامات کو سنبھالنا، امور خانہ داری، مہمان نوازیاں یہ تمام کام عورتوں کے ہی ذمہ ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اقتصادی ذمہ داریوں میں بھی ہاتھ بٹاتی ہیں پھر وقت لائیں کہاں سے؟ خواتین کے اس وقت کی کھینچا تانی کو سماج نے سہولیات مہیا کر کے انھیں تعاون نہیں دیا ہے۔ مناسب بے بی سیٹنگ، گھریلو عمدہ خانہ داری جو کہ موزوں رقم میں مہیا ہو جاتی تو عورتوں کا تناؤ کسی حد تک کم ہو جاتا۔ بچوں کو انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی اسکولوں میں داخلہ نہ دلایا جائے تو وہ ترقی نہیں کریں گے اس طرح کی اندھی تقلید میں اضافہ ہوتے ہوئے وہ معاشرتی سطح تک پھیل چکا ہے۔ جس کی بناء پر بچوں کی کیفیت دورخی یعنی کہ نہ تو مادری زبان اور نہ ہی انگریزی زبان پر عبور اس نوعیت کی ہو چکی ہے اور اگر ہماری اپنی ہی زبان کمزور اور ناقص ہو تو اس کا براہ راست اثر انسانی غور و فکر پر ہوتا ہے جو کہنا ہے وہی پیشکش صحیح نہیں ہوتی۔ پھر ایسے بچوں کے سرپرست بھی یہ پینترا بدلتے ہیں کہ جاتے وقت کہہ جاتے ہیں تم سب کھاتے کھاتے ٹی وی دیکھو اور کتاب پڑھو۔ ہم ابھی آتے ہیں اور بچے کو کہانی سناتے وقت ایک تھا ڈورے مان اور ایک تھی سوجو کا کہنے لگتے ہیں۔ چند رئیس زادے جو انگریزی اسکولوں میں گفتگو نہیں کر پاتے۔ والدین کے اسکول آنے سے پشیمانی محسوس کرتے ہیں اور گھر میں والدین اور بچوں کے درمیان ایک مخفی جنگ چلتی رہتی ہے۔ بچے اور والدین کے رہن سہن اور سوچ میں تضاد پیدا ہو کر آپسی چپقلش جاری رہتی ہے۔

چند گھروں میں اعلیٰ تعلیم کی بناء پر بھرپور پیسے آنے لگے ہیں۔ نوجوانوں کی اس بھرپور کمائی کو سماج اور مارکیٹ کا تعاون حاصل ہو گیا۔ بازار اور مارکیٹ میں اشیا کی فراوانی ہو گئی۔ بڑے بڑے پرکشش مال تیار ہو گئے۔ پیزا، برگر، آئس کریم کی برانڈیڈ دکانوں میں اضافہ ہو گیا۔ مال میں خریداری اور فاسٹ فوڈ دکانوں کا چلن عام ہو گیا۔ یہ آج کا فیشن بن چکا ہے۔ برانڈیڈ کپڑے جن بچوں کے پاس نہیں ہوتے انھیں رئیس زادے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح فضول خرچی اور نمود و نمائش کی جانب پورا سماج آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ سادگی پسندانہ رہن سہن، کفایت شعاری تو مزاحیہ الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔

پرانے زمانے میں اگر گھر میں پونجی زیادہ ہوتی تب بھی رہن سہن عام درجے کا ہی ہوا کرتا تھا۔ اب پیسوں کا دکھاوا، گھروں میں دیدہ زیب فیشن ایبل ملبوسات، رہن سہن اور کار وغیرہ میں دکھائی دیتا ہے۔ ادب و

ثقافت، تہذیب وتمدن، اقدار، اخلاقیات، سنجیدگی، خاکساری دیگر لوگوں کے ساتھ معاونت کرنا قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ ’دکھاوے کی کھڑکیاں تو بھری ہوئی ہوتی ہیں لیکن کوٹھی کے کمرے خالی ہوتے ہیں‘۔ دلائی لامہ کا یہ قول زیادہ سے زیادہ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

رابطوں کے ذرائع جتنے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔ اتنے ہی براہ راست اور باہمی تعلقات میں کمی آتی جاتی جا رہی ہے۔ اب لوگ اپنے ہمسایوں کے وہاں بھی بہ آسانی آتے جاتے نہیں ہیں۔ اب صرف زیادہ توجہ ہے اسمارٹ نیس کی جانب۔ سیدھے سادے انسانوں کو ٹھہرا کر یہ اسمارٹ نیس کی لہر بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اب صحیح معنوں میں بچپن سے ہی بچوں کو ٹھہرا کر قیمتی وقت یعنی کہ کوالٹی ٹائم کا ایک مفہوم یہ ہے کہ بچہ جب کہتا ہے تب اس کے لیے ڈرائنگ بنائیں۔ گھومنے پھرنے جائیں، کھیلنے میں اس کا ساتھ دیں، کتابیں پڑھنے میں، کوئی اشیا جو بچے نے تیار کی ہیں اسے دیکھنے کے لیے وقت نکالیں، اس کی مرضی کے مطابق یہ اہم کام انجام دیں اور جب ممکن نہ ہو تب کہہ سکتے ہیں کہ آج مجھے اپنا کام کرنا زیادہ ضروری ہے یہ مکمل ہو جائے تو ہم مل کر بیٹھیں گے۔ قیمتی وقت کا دوسرا مفہوم اس کے جینے کا معیار اچھا ہو۔ اس مقصد کے تحت دیا جانے والا کوالٹی ٹائم۔ پھر اس طے شدہ وقت میں آپ کتابیں پڑھ کر سنائیں یا پھر اس کے ساتھ نئی سرگرمی انجام دیں، ڈرائنگ بنائیں، کوئی نظم سنائیں، اچھی سی فلم دیکھیں، نئی ڈش تیار کریں۔ مستقبل میں بھلے ہی وہ اپنی اولاد کے ساتھ یہی سب کام انجام دیں۔ ہم یہ توقعات نہیں رکھتے لیکن وہ یہی سب کام ضرور انجام دیں گے۔ کبھی کبھار ایک دو روز کی چھٹی لے کر بچے کی پسندیدہ جگہ پر جائیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ کسی بھی تہذیب یافتہ انسان کا بچوں کے ساتھ رہنے سے اس کی تہذیب وتمدن پر عمدہ اور مثبت اثر پڑتا ہے۔

معیاری زندگی کی جانب پیش رفت کرنے کے لیے گھروں میں کیا تبدیلیاں لانی ہوں گی؟ اول گھر کے بڑے افراد آپس میں نہ جھگڑیں، گھر کے لوگ بھی آپس میں سیاست برتتے ہیں اس سے گریز کریں۔ گھر میں پیار، اخلاص اور امن وسکون کا ماحول ہونا چاہیے۔ گھر میں غذا سادہ اور تندرستی بخش ہو گھر کے تمام لوگ ایک دوسرے سے باہمی گفتگو کریں۔ سب کا ایک دوسرے پر اعتماد ہو۔ گھر میں کوئی بھی حکم شاہی کا برتاؤ نہ کرے، سب ایک دوسرے کی خوبیوں پر حوصلہ بڑھائیں۔ کوئی کسی کی بے احترامی یا بے ادبی نہ کرے۔ گھر میں سب مل جل کر کام انجام دینے کی عادت ڈالیں۔ بدکلامی اور گالی گلوچ سے پرہیز کریں۔

ایسی کئی باتیں تلاش کرکے ان پر عمل کرنا ہوگا۔ وقت اور زمانے کے ساتھ خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی اور یہ تغیر عمدہ، فائدے مند اور گھر کو کوالٹی ٹائم کی جانب پیش قدمی کرنے والا اور مثالی ہوگا۔ اگر ہم یہ تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو گئے تو آگے کی نسل در نسل یہ روایات بنتی چلی جائیں گی اور ہمیں اس شکایت کا قطعی موقعہ نہیں ملے گا کہ نئی نسل انٹرنیٹ میں جنون کی حد تک پاگل ہو کر رشتوں کو فراموش کر چکی ہے۔ ’اگر کسی ملک کو بدعنوانی سے پاک اور اچھے ذہنوں کی پناہ گاہ بنانا ہو تو میرا ماننا ہے کہ سماج کے تین ارکین ہیں جو یہ تبدیلی لا سکتے ہیں۔ والد، والدہ اور استاذ‘

(مولانا ابوالکلام آزاد)

□□□

Syed Naushad Begum Mahmood
Shri Darshan Apartment
B/203, Mumbai Puna Road
Shashtri Nagar, Kalwa
Distt. Thane-400605 (M.S)

فرہنگ آصفیہ

فاطمہ صائمہ۔ آپ بہت بڑی مرتاض وعارفۂ زمانہ تھیں۔ شیخ فرید الدین گنج اور شیخ نجیب الدین کی دینی بہن تھیں۔ ۱۰ شعبان ۶۹۶ھ کو رحلت فرمائی۔ آپکا مزار پرانی دہلی میں مٹیا دروازے کے باہر نخاس کے قریب واقع ہے۔ آپ کی نسبت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ لکھتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر فرمایا کرتے تھے کہ اگر عورتوں کو خلافت جائز ہوتی تو میں فاطمہ صائمہ کو اپنا خلیفہ کرتا۔ حضرت سلطان جی کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ اور اپنے ہاتھ سے سوت کات کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کا غلاف بنایا تھا جو اب تک موجود ہے۔ اور عید و بقرہ عید کو پڑھا جاتا ہے۔ آپ کی گزران سوت کاتنے پر تھی۔

کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت

گلشن آرا

اردو شاعری میں غزل ایک ایسی صنف ہے جسے ہم مقبول بھی کہہ سکتے ہیں اور مظلوم بھی، کیونکہ بقول پروفیسر نظیر صدیقی:

’ ہمارے ناقدین کا ایک طبقہ، جہاں تاثراتی میلان کے تحت غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہنے پر مصر ہے تو دوسری طرف ایسے حضرات کی بھی کمی نہیں جو اس اسپرٹ کو خالص ہیئت کی بنا پر نیم وحشیانہ فن گردانے پر آمادہ ہیں۔ ان دو انتہا پسند نظریات کے درمیان ایک حلقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے، جنھوں نے غزل کو روح شاعری تسلیم کیا ہے۔ جس میں ہماری تہذیب و تمدن اور فطرت و معاشرت کی بہترین عکاسیاں ہیں اور جو واردات قلبیہ و کیفیات ذہنیہ کی تفہیم کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہے۔ غزل میں مشرق و مغرب کے مزاج، عام انسانی فطرت کے اسرار و رموز کے اظہار کی جس قدر گنجائش ہے، وہ شاید کسی اور صنف سخن میں ممکن ہی نہیں۔‘

پروفیسر کلیم عاجز کا اصل تعلق اسی تیسرے قبیلے سے ہے۔ انھوں نے ایک طرف اردو شاعری کی اس عظیم روایت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک نئے رنگ و رامش، تازگی و توانائی سے قریب تر بھی کیا اور بدلتے ہوئے شعری و ادبی مزاج و میلان کو بھی ملحوظ رکھا۔ پروفیسر کلیم عاجز کی پوری علمی، ادبی اور شعری کائنات ہماری اسی مشترکہ تہذیب و تمدن کا قیمتی سرمایہ ہے۔

آزادی کے بعد اردو شعر و ادب کے اُفق پر جو نام اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں کلیم عاجز یقیناً ایک نہایت ہی محبوب و معتبر نام ہے۔ انھوں نے اپنی مخصوص و منفرد شاعری سے پوری اردو دنیا کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ قومی اور عالمی مشاعروں میں کلیم عاجز کی موجودگی کامیابی کی ضمانت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ تقریباً پچاس برسوں تک اردو شاعری کی دنیا اور مشاعروں کی محفل میں ان کی دلکش و مترنم آواز نے انھیں بے پناہ عزت، شہرت اور دولت سے نوازا۔ لال قلعہ کے مشاعروں میں برسوں ان کی شرکت رہی، بلکہ صوبہ بہار سے کلیم عاجز کی کئی مرتبہ تنہا ہی نمائندگی ہوتی رہی۔ وہاں بھی انھوں نے اپنی غزلیہ و نظمیہ شاعری سے ایک خاص مقام و مرتبہ پایا۔

کلیم عاجز اردو شاعری کی ایک ایسی آواز بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جس کی کوئی دوسری نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی، کیونکہ وہ اپنی دینی و مذہبی ذات اور علمی و ادبی کائنات میں بے نظیر تھے۔ پوری ادبی و علمی دنیا جانتی ہے کہ کلیم عاجز کو کم عمری میں ہی ایک ایسے سانحہ عظیم سے دو چار ہونا پڑا جسے وہ آخری سانس تک اپنے ذہن و دماغ سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اسی صدمہ عظیم نے کلیم عاجز کو اردو شعر و ادب کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، مگر کلیم عاجز کا حیرت انگیز کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے کرب و اضطراب، درد و داغ کو کچھ اس طرح اپنی شاعری میں برتنے کا کام کیا ہے، یا یوں کہیں کہ اسے کچھ اس انداز سے اپنے شعری پیکر کے سانچے میں ڈھال کر آنے والی نسلوں کے سامنے رکھ دیا ہے کہ اُن کا ذاتی غم سب کا غم بن گیا ہے۔

کلیم عاجز کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زخموں کو پھول بنانے کا ایک نیا تجربہ بالکل ہی جدید لب و لہجہ میں پیش کر کے ایک نئے

باب کا اضافہ کیا ہے اور اپنے آنسوؤں کو موتیوں کا روپ و رنگ دے کر جدید اردو شاعری کا وقار و معیار بڑھایا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے ذاتی غم کو جس صبر و ضبط، احتیاط اور جیسی فنی چابک دستی کے ساتھ اپنے شعروں میں پیش کیا ہے وہ اردو کی جدید شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ درد و داغ بس ابھی کل کی بات ہے جس سے شاعر دو چار ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی فنکارانہ ذہانت اور شعری بصیرت کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ پڑھنے والا دور ہی سے پہچان جاتا ہے کہ یہ لب و لہجہ کلیم عاجز کا ہے۔

کلیم عاجز دراصل لہجہ کے شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی فنی قوت سے گویا، ہر مقام پر پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری میں میر کا سوز و گداز، لب و لہجہ اور انداز و اسلوب ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ انھوں نے میر کی نری پیروی نہیں کی، بلکہ خاص شعور و خلوص کے ساتھ میر کے لہجہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسے عصری تناظر میں اسے اپنا جدید انداز اور لب و لہجہ بھی عطا کیا ہے۔ بقول غلام سرور:

'کلیم عاجز میرے ہم عصر ہیں، ہم عمر ہیں، ہم وطن ہیں اور ہم مشرب ہیں۔ ہم دونوں ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں اور آ کر عظیم آباد میں بس گئے۔ پٹنہ جو ایک لمبی سڑک کہی جاتی رہی ہے اس سڑک پر پٹنہ کالج سے بی۔ این۔ کالج تک ہماری مشترک راہ رہی ہے۔ وہاں سے میں اپنے وطن دانا پور چھاؤنی کے لیے آگے بڑھ گیا اور کلیم عاجز اپنے وطن موضع تیلھاڑہ کی خاک، خون، آگ، دھواں اپنے سینے میں دبائے خونِ جگر سے متاعِ قلم کو تابدار کرتے ہوئے شاعر بے مثال بن گئے۔'

کلیم عاجز کی اب تک سترہ شعری و نثری تخلیقات منظر عام آ چکی ہیں۔ شاعری ہی نہیں ان کی نثر کی بھی اپنی ایک خاص اہمیت ہے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا (1976) میں جہاں ایک طرف ان کی شاعرانہ عظمت دیکھنے کو ملتی ہے وہیں دوسری طرف ان کی خودنوشت میں اس سانحہ کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے جس سے انھیں گزرنا پڑا۔ کلیم عاجز کی نثر کا مرتبہ مسلم ہے اور ان کی شاعری کا کیا کہنا، فراق گورکھپوری نے کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ قرار دیا ہے تو یقیناً اس میں مبالغہ نہیں۔ کلیم عاجز کے ادبی و شعری سرمایہ میں ان کے اندر کی آگ ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی غموں اور زخموں کو پھول بنا کر اردو شاعری میں ایک اور میر کا دروازہ وا کرنے کا کام کیا ہے اور سارے جہاں کے درد و داغ، غم و غصہ، کرب و اضطراب اور اپنے تجربات و احساسات کو نہایت ہی خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے دلکش و حسین شعروں میں ڈھال کر ایک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں غلط نہیں لکھا ہے کہ:

'سب کہتے ہیں کہ بہار کے حادثے نے کلیم کو شاعر بنا دیا، یہ بات ٹھیک نہیں ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ الٹی بات ہے۔ بہار کے حادثے نے کلیم کو شاعر نہیں بنایا، کلیم نے بہار کے حادثے کو شاعری بنا دیا، اس لیے کہ یہ حادثہ بہار میں ہی نہیں، سارے ہندوستان میں گزرا، گلیوں، راستے گاستے گزرا پورب پچھم میں گزرا۔ کہیں آسام سے پشاور تک کوئی اس حادثے کو شاعری نہ بنا سکا۔'

(ہاں چھیڑو وہ غزل عاجز)

کلیم عاجز صرف شاعر نہیں ایک مبلغ بھی تھے انھوں نے ساری دنیا میں اسلامی روایات کی پاسداری کے عظیم پیغامات کو عام کیا۔ ذاتی زندگی میں کلیم عاجز نہایت ہی انسان دوست اور غریب پرور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی آواز میں ایک جادو تھا جو بھی سنتا برسوں یاد کرتا۔ ان کے اشعار آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی فسادوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور چیخ و پکار کا منظر بھی، مگر سچ یہی ہے کہ کلیم عاجز کی طرح انھیں شاعری میں ڈھالنے والا کوئی دوسرا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ آج جب کہ کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت اور نثری خدمات کے ساتھ ساتھ دین کی بے لوث خدمت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مرتبہ پھر کلیم عاجز کو نئے سرے سے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کلیم عاجز کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ پہلا دور خود کلامی اور دوسرا اور تیسرا دور بالترتیب ارباب حکومت اور فرد واحد سے خطاب کا دور ہے:

'کلیم عاجز نے 1964 سے جب میر کا مطالعہ شروع کیا تو ان کی کیفیات سخن سے پوری طرح متاثر ہوتے رہے اور تین سالوں میں ان کو اپنا ہم حال اور ہم کیفیت پا کر ان کا پورا اثر قبول کر کے ان کی باضابطہ پیروی شروع کر دی اور 1966 میں مکمل طور سے میر کے اسلوب میں اپنی پہلی غزل

کہی۔ اس غزل میں کلیم عاجز میر کی پیروی میں اس درجہ
کامیاب ہیں کہ اگر کوئی اسے دیوانِ میر میں شامل کر دے
تو اس کی شناخت مشکل ہو جائے گی۔'

یہ تو کھلی بات ہے کہ میر میر ہیں اور کلیم عاجز، کلیم عاجز۔ ظاہر ہے کہ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف غالب نے کیا ہے۔ میر کا فرمایا ہوا آج بھی مستند و معتبر ہے۔ کلیم عاجز کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عہدِ میر کے سانحات و حادثات سے ایک خاص قسم کی غذا لے کر عہدِ حاضر کے ظلم و زیادتی، فتنہ و فساد کے تناظر میں اپنی شاعری کی داغ بیل رکھی۔ میر کے عہد کے تقاضے اور مطالبے کچھ اور تھے کلیم عاجز کے حالات و حادثات کچھ اور، مگر یہ کم بڑی اور اہم بات نہیں ہے کہ میر کے عہد کے انداز و اسلوب اور لب و لہجہ کو آج کے عہد میں آج کے مسائل و معاملات کے پس منظر میں انھوں نے پوری کامیابی سے دکھایا۔

بڑی کشمکش میں ہے یہ زندگی
تڑپنا بھی ہے، مسکرانا بھی ہے

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

فصل بہار لوٹ کر سب لے گئی بہار
ہم اہتمام جشن چراغاں میں رہ گئے

خزاں کا دور تیری بے رخی کو کہتے ہیں
بہار تیری توجہ کا نام ہے پیارے

اگر ہم نہ دیں اپنا خون جگر
وہ ہاتھوں میں مہندی لگائیں گے کیا

زمانہ صبر کر لیتا ہے عاجز ہم بھی کر لیں گے
خلش دل کی مٹا لینے کو دو آنسو بہانے دو

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیم عاجز کی شاعری جدید اردو ادب کا ایک ایسا حسین و دلکش گلدستہ ہے جس کی خوشبو آنے والی نسلوں کے مشامِ جاں سدا معطر کرتی رہے گی۔ انھوں نے جو کچھ شعری و نثری ادبی کارنامہ اردو کو دیا ہے، وہ ہماری زبان اور مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ▢▢▢

Gulshan Ara
B.R.A Bihar University
Distt. Muzaffarpur-842001 (Bihar)

فرہنگ آصفیہ سے

امام ضامن۔ ع۔ اسم مذکر۔ یہ حضرت سیدنا علی رضا بن موسی الکاظم کا جو آٹھویں امام ہیں عرف ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے آپ کو امام ثامن بھی کہتے ہیں آپ ایک سو اڑتالیس ہجری میں بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن ہے اور القاب رضا۔ صابر۔ زکی۔ دولی ہے آپ خلفائے عباسی میں سے خلیفہ مامون بن ہارون رشید کے زمانہ میں موجود تھے۔ خلیفہ مذکور نے اپنی ایک خاص منت پوری ہو جانے کے سبب اپنا خلیفہ قرار دیکر اپنی بیٹی مسماۃ ام حبیب سے ۲۰۲ھ میں نکاح کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی زمانہ میں خلیفہ وقت نے کربلائے معلی جانے کی سخت پابندیاں بمنزلِ ممانعت کردی تھیں پس آپ وہاں جانے والوں کے کفیل و ضامن ہو جایا کرتے تھے۔ تاکہ زائرین ثوابِ زیارت سے محروم نہ رہیں پس اس وجہ سے آپ کو امام ضامن کہنے لگے۔ تاریخ الائمہ ایک امامیہ مذہب کی کتاب میں درج ہے کہ آپ جس طرح خلق اللہ کی بخشش کے ضامن ہیں اسی طرح حیوانات کے بھی بعض اوقات صیادوں سے ضامن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کتاب مذکورہ میں آہو و صیاد وغیرہ کا قصہ لکھ کر اس امر کی تصدیق کی ہے۔ لہذا بوجوہ بالا مستورات اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ جب کوئی سفر کو سدھارے یا کہیں بیاہ خواہ منگنی ٹھیرائی جائے اور امام صاحب کے نام کا روپیہ پیسہ خواہ اشرفی یا کوئی سکہ بازو پر باندھا جائے تو آپ مراد پر پہنچانے کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ جس وقت مسافر منزلِ مقصود پر پہنچا یا وہ کام ہو جاتا ہے تو اس رقم کو سیدوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ غرض آپ ۵۵ برس زندہ رہے اور آخر صفر ۲۰۳ھ میں زہریلے انگوروں کے از جانب خلیفہ کھلائے جانے سے رحلت فرمائے عالم قدس ہوئے۔ اس موت کی آپ نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ آپ کا مزار پر انوار شہر طوس واقع خراسان متصل قبر ہارون رشید ہے۔

عقیلہ

موم کی گلیاں

تجزیاتی مطالعہ

بانو قدسیہ کئی بہترین ناولوں کی خالق ہیں۔ ان کا ہر ناول اردو ادب میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ''موم کی گلیاں'' بانو قدسیہ کے ابتدائی ادبی سفر کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ایک علامتی ناولٹ ہے جو 1995 میں منظر عام پر آیا۔ یوں تو ناول کی کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ خرم جو ناول کا ہیرو ہے پہلی ہی نظر میں شیریں (ہیروئن) کو دل دے بیٹھتا ہے مگر شیریں کے والد اس کی شادی کسی سرکاری افسر سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ سماج میں ان کو اونچا مقام حاصل ہو سکے۔ لہٰذا شیریں کی شادی خرم کے بدلے شاہ نواز سے کر دی جاتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی میں وہی روایتی پن ہے مگر مصنفہ کا مخصوص و دلکش انداز بیان کہانی میں پیدا کر دیتا ہے۔ بانو قدسیہ نے علامت کے طور شہد کی مکھیوں کو بطور کردار استعمال کیا ہے۔ مصنفہ اس ناول میں نئی نسل کو شہد کی مکھیوں کی طرح مل جل کر رہنے اور محنت و مشقت کے ساتھ مل جل کر رہنے کا درس دیتی نظر آتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ جس طرح مکھیاں اپنے اپنے کاموں کو تقسیم کرتی ہیں بلکہ کچھ مکھیاں سوائے آرام کے کچھ کرتی ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان میں کبھی آپس میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی کسی میں لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا، کبھی ایک مکھی دوسری مکھی سے یہ نہیں کہتی کہ میں نے اپنے حصہ کا کام کر لیا ہے اب کوئی اور کرے۔ ٹھیک یہی اتحاد پیار و محبت انسانوں میں بھی ہونا چاہیے۔

''موم کی گلیاں'' ناولٹ میں دراصل دو کہانیاں بیان کی گئیں ہیں۔ اوّل شہد کی مکھیوں کے کلچر، ان کے چھتہ بنانے اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے تک کی کہانی پر مبنی ہے۔ دوم میں خرم اور اس کے گھر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جہاں کہیں شہد کی مکھیوں کا ذکر آتا ہے وہاں حیرت ہوتی ہے کہ مصنفہ نے آخر کار مکھیوں اور ان کی زندگی سے متعلق اتنی گہری و تفصیلی معلومات کیسے حاصل کی ہوں گی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ خود کئی مہینوں بلکہ میں تو کہوں گی کہ برسوں شہد کی مکھیوں کے چھتے کے پاس ڈیرا ڈال کر بیٹھی ہوں گی۔ مکھیوں کی زندگی کا جتنی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہے وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ یہ ناولٹ تقریباً 85 صفحات پر مشتمل ہے اور آدھے سے زیادہ صفحات میں مکھیوں کی زندگی اور ان کی افزائش نسل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر ان صفحات کو پڑھ کر قاری کو کسی بھی لمحہ اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ بعض جگہ یہ معلومات ہمیں اصل کہانی کو سمجھنے میں اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ناول کی کہانی تقسیم ہند سے شروع ہوتی ہے۔ ''رکی نکی'' کہانی کا راوی اہم کردار ہے جو مرکزی کردار خرم کا چھوٹا بھائی ہے۔ تقسیم سے پہلے بڑے میر صاحب کے خاندان کے سبھی لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ خاندان کے تمام افراد سر جھکا کر بڑے میر صاحب کا حکم مانتے تھے۔ ان کا حکم پتھر کی لکیر سے کم نہیں تھا۔ ''رکی نکی'' اپنے دادا میر صاحب کے رعب اور دبدبہ کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

''بڑے میر صاحب جدھر کا رُخ کرتے سارے افراد خانہ سینوں پر ہاتھ باندھ کر ان کے پیچھے ہو لیتے۔''

(موم کی گلیاں صفحہ نمبر 5)

فنکار جب کچھ تخلیق کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ سوال، کچھ جواب ضرور ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنی فنکارانہ صلاحیت سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جب کوئی افسانہ نگار یا ناول نگار

کوئی کہانی لکھتا ہے تو اس کا کوئی مرکزی خیال یا نقطۂ نظر ضرور ہوتا ہے جسے وہ قاری تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ''موم کی گلیاں'' کا مرکزی خیال افزائش نسل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ناول میں بھی کئی مرتبہ خرم اور ''رکی تکی'' کے ذریعے اس نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریے کا بانی خرم ہے مگر ''رکی تکی'' اس نظریے کو مزید پھیلاتا ہے۔ مصنفہ بتاتی ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ افزائش نسل کے لیے ہو رہا ہے۔ اس ناول کا اختتام المناک ہے اس میں افزائش نسل کا فلسفہ تو پورا ہوتا نظر آتا ہے مگر خرم اور شیریں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ اس ناول میں مکھیوں کی زندگی پر روشنی ڈال کر دراصل غریب اور پسماندہ طبقہ کو محنت اور لگاتار کوشش کرنے کا پیغام بھی دیتیں ہیں۔ ناول کے کرداروں اور مکھیوں میں مماثلت حقیقت میں انسانوں کو محنت کش، ایماندار اور مستقبل پر دھیان دینے کی غرض سے پیش کی گئی ہے۔ مصنفہ انسانوں کو درس دینے کی لیے مکھی جیسی مخلوق کا انتخاب کرتی ہیں اور یہ ثابت بھی کرتیں ہیں کہ ہم انسان اس ادنیٰ سی مخلوق سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ انسان مفاد پرست ہوتا ہے اس کے ذریعے کیے گئے کام صرف اس کی اپنی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ اس میں ایک دوسرے کو لے کر اتنا اختلاف اور اتنا حسد ہے کہ وہ کبھی خوش ہی نہیں رہ سکتا۔ انسان نے چاہے جتنی ترقی کرلی ہو رہنے کے لیے محل بنوا لیے ہوں مگر اب بھی کچھ انسان سڑکوں پر، فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ لوگوں کا دسترخوان مختلف اور لذیز کھانوں سے بھرا ہوتا ہے تو کچھ لوگ سوکھی روٹی کھا کر پیٹ بھرتے ہیں اس کے برعکس شہد کی مکھیاں چاہے وہ کام کرتیں ہوں یا نہیں سب کو ایک سی غذا ملتی ہے، ہر مکھی ایک سی زندگی بسر کرتی ہے یہاں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

> مجھے مکھیوں پر تعجب آرہا تھا ہم لوگ ان کے سامنے کتنے خود غرض اور کاہل تھے۔ ہمارے اپنے اپنے بینک بیلنس ہیں اور اپنی اپنی کوٹھیاں ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ ہمارے دل کا چور بیت المال پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ تو خیر مشکل کام ہے ہمیں تو شہر بسانا بھی نہیں آتا۔ کوٹھیاں ہیں کہ ایک سے دوسری نہیں ملتی۔ مکان ہیں کہ ان کی ساخت عجیب سے عجیب نمونہ پیش کرتی ہے ہم نے پنکھے ایجاد کر لیے ہیں۔ برف خانے بنا لیے ہیں لیکن اکثریت کے گھر نہ سردیوں میں گرم ہیں نہ گرمیوں میں ٹھنڈے۔ یہ ننھی ننھی جانیں ہیں لیکن اپنے شہر کو ہمیشہ حرارت سے بچاتی ہیں۔

(موم کی گلیاں صفحہ نمبر 23)

''موم کی گلیاں'' ناولٹ میں بانو قدسیہ ہلکا سا اشارہ جدوجہد آزادی کی طرف بھی کرتیں ہیں ناول کی شروعات ''تقسیم سے پہلے'' جیسے جملوں سے ہوتی ہے تو قاری کا ذہن کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر تقسیم سے پہلے ملک کے حالات پر ضرور دوڑ پڑتا ہے آگے مصنفہ مکھیوں کے اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ کس طرح ایک ملکہ مکھی پورے چھتہ کو سنبھال کر رکھتی ہے۔ چھتہ میں اتنی محبت اور اتحاد ہوتا ہے کہ کبھی دوسری مکھی ملکہ کے خلاف آواز نہیں اٹھاتی۔ اس ملکہ کی جگہ کبھی کوئی نہیں لیتا جب تک کہ وہ ملکہ خود اپنی مرضی سے چھتہ نہ چھوڑے کوئی اُسے معذول نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں مصنفہ اشارۃً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان میں وہ پیار محبت اور اتحاد ختم ہو گیا تھا اس لیے غیر ملکی قوم (انگریزوں) نے بہادر شاہ ظفر کو ان کے ہی ملک سے بڑی آسانی سے جلاوطن کر دیا۔ اگر ہندوستانی عوام اس وقت متحد ہو جاتی تو ہمارے حکمراں یعنی بہادر شاہ ظفر کو کوئی طاقت نہیں نکال سکتی تھی۔ مگر ہندوستانی عوام میں اختلاف ہونے کی وجہ سے چھتہ کے حکمراں کو نکال دیا گیا نتیجہ چھتہ بکھر گیا۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور مکھیاں تتر بتر ہو گئیں۔

''موم کی گلیاں'' میں ایک کنبہ اور اس میں رہنے والوں کو شہد کی مکھی اور اس کے چھتہ میں مماثل قرار دیا ہے۔ جس طرح مکھیوں کی ملکہ کا کام صرف افزائش نسل ہوتا ہے انڈے دینے کے علاوہ وہ دوسرا کام نہیں کرتی۔ اس کا کام نسل کو آگے بڑھانا اور چھتہ کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ ٹھیک یہی مماثلت کنبہ کے بڑے میر صاحب میں ہے۔ جب تک وہ زندہ تھا پورا خاندان مکھی کے چھتہ کی طرح ایک گھر میں رہتا تھا میر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے الگ الگ شہروں میں بس جاتے ہیں۔ خرم ناول کا ہیرو ان نرگس مکھی کی طرح ہے جو سوائے کھانے اور آرام کرنے کے کچھ نہیں کرتے۔ مگر جب افزائش نسل کا سوال ہوتا ہے تو یہی نکمے، نکھٹو، سست وجود والے اپنی جان کی بازی لگانے میں دیر نہیں کرتے۔ شیریں (ہیروئن) چھتہ کی اس ملکہ کی طرح ہے جو شادی کی خواہش میں اتنی اونچی اڑان بھرتی ہے کہ اس کا عاشق نرگس (شاہ نواز) اس کو ضرور ملتا ہے مگر اس کا دل بھی ملکہ مکھی کی طرح بجھ جاتا ہے پھر کبھی وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھتی اس کا کام صرف نسل کو آگے بڑھانے تک محدود رہ جاتا ہے۔ خرم چونکہ بے روزگار رہتا ہے اس لیے شادی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے اب اس کا مقام ان ہارے ہوئے نرگس کی طرح ہو جاتا ہے جسے چھتہ کی باقی مکھیاں بھی چھتہ میں رہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ عذا خرم کی بہن ان

کارکن مکھیوں کی طرح ہیں جو سارا دن گھر کی صفائی اور اس کے کاموں میں صرف کر دیتی ہے اور کبھی اُف نہیں کرتیں۔

کہانی کا راوی ان تمام کرداروں کا تعارف کچھ اس طرح کرواتا ہے۔

''میں سوچنے لگا ہمارا گھر بھی مکھیوں کا چھتہ ہے اس میں ابا جان ہر طرف سے دولت لا کر جمع کرتے ہیں۔ اماں اور تم محنتی اور جفاکش رکن ہو جو سارا دن جان لڑاتی ہو۔ میں ست الوجود نکما مرد ہوں جو بس کھانا پینا اور آرام کرنا چاہتا ہے۔''

(موم کی گلیاں صفحہ نمبر 25)

مختصر یہ کہ ''موم کی گلیاں'' ایک بہترین ناول کی حیثیت رکھتا ہے کہانی میں کوئی نیا پن نہیں یہی چیز مصنفہ کی سب سے بڑی مہارت کا ثبوت ہے کہ ایک عام کہانی کو اتنے دلکش اور نئے انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک ادنیٰ مخلوق کے بارے میں اتنی گہری اور دلچسپ معلومات رکھنا اور اسے انسانی زندگی سے مماثل قرار دینا ان کی فنکارانہ صلاحیت کی بہترین مثال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بانو قدسیہ خود چھتہ کا حصہ ہوں۔ یہ ناول ایک اصلاحی ناول کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے کئی سوال قاری کے سامنے پیش کیے ہیں۔ لہٰذا کہانی کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ کہانی کاغذ پر تو ختم ہو جاتی ہے۔ مگر قاری کے ذہن میں برابر چلتی رہتی ہے۔ اسے صرف افزائش نسل کا فلسفہ ہی نہیں بلکہ زندگی کا فلسفہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

بانو قدسیہ کا اسلوب دیگر ناول نگاروں سے خاصہ مختلف ہے۔ وہ علامتوں کا استعمال ضرور کرتیں ہیں لیکن یہ علامتیں عام قاری کو آسانی سے سمجھ میں آ جاتیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی زبان کے الفاظ اس خوبی سے استعمال کرتیں ہے کہ غیر مانوس نہیں لگتے۔ موم کی گلیاں میں مری کی خوبصورت وادیوں کا اس طرح بیان کیا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے پورا منظر آ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ موم کی گلیاں ایک کامیاب علامتی اور اصلاحی ناول ہے اور بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

□□□

Aqeela
P-115, Basti Khawaja Meer Dard
Near Zakir Hussain College
New Delhi-110002

فرہنگ آصفیہ

آفتابہ۔ ف۔ اسم مذکر۔ اصل میں (آب۔ تابہ) تھا۔ پہلوی (آفتادہ) ژ (آفتادہ) عوام (استادہ)۔ (فرہنگ نویس اس سیدھی بات کے بیان کرنے میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔ کوئی آفتاب سے منسوب کرتا ہے کوئی گولائی سے اس کے معنی نکالتا ہے۔ کوئی چلمچی بتاتا ہے حالانکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ زبان فارسی میں بائے موحدہ اور خائے معجمہ کا ہم بدل ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان اور زفان۔ باو گفت فا و گفت۔ زبانہ اور زفانہ آیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوا ہے اور نیز آفتابہ میں دستی لگانا اور اس کے اوپر سر پوش کا ہونا اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گرم پانی کا لوٹا ہے پھر جو اپنے تئیں وقت میں ڈالیں تو کیا فائدہ؟)

( ) ایک قسم کا لوٹا ہوتا ہے جس کے پیچھے ہاتھ کے بچاؤ کے واسطے دستی لگی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر سر پوش ہوتا ہے اس میں گرم پانی لیکر منہ ہاتھ دھوتے یا دھلاتے ہیں۔ گنگا ساگر

ماہِ کامل ہے ترے منہ دھونے کی سیلا بچی
آفتاب اے ماہِ تاباں آفتابہ ہو گیا (ناسخ)

منہ جو تو دھونے لگا وقتِ سحر اے رشکِ مہر
صاف سونے کا برنجی آفتابہ ہو گیا (شہیدی)

منہ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب (میر تقی)

منہ دھرتے وقت اسکے اکثر دکھائی دے ہے
خورشید لے رہا ہے اک روز آفتابہ (میر تقی)

رفقائے سرسید اور تعلیم نسواں

حدیثہ افضل

اٹھارہویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ سماجی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس عہد میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کا اقتدار قائم ہونے سے ملک میں روشن خیالی کے ساتھ ایک خاص قسم کی تہذیبی کشاکش کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ ایسے حالات میں ہندوستانی مسلمان قوم سب سے زیادہ زبوں حالی کا شکار ہوئے۔

انگریزی دور حکومت میں مسلمانوں کی خستہ حالی کا جائزہ لیتے ہوئے نذیر احمد اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

''انگریزی عملداری میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے کہ ایک دریائے مؤاج بہہ رہا ہے اور مردم و مرغ و مور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق اس سے سیر یاب ہوتے چلے جاتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ موسم تابستان میں دریا کی ریتی پر پیاسے تڑپ رہے ہیں۔''

(زینت بشیر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ ص 7)

انگریزی حکومت کے ذریعے ہندوستان میں بہت سے تعلیمی ادارے قائم ہوئے ان اداروں میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ مرکوز کی گئی۔ مغربی تعلیم کے زیر اثر ہندوستان کے روشن خیال اور دانشور طبقے میں بھی ذہنی بیداری پیدا ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصلحین نے تعلیم نسواں کی بھی پرزور حمایت کی۔

دیکھا جائے تو انیسویں صدی میں ہندوستان میں سماجی بیداری اور اصلاحی تحریکیں زور پکڑتی جارہی تھیں اور مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے نقوش بھی ابھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی زمانے میں مسلم معاشرے کے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں بھی قوم کے تئیں بیداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں میں سرسید احمد خاں ایسے پہلے شخص تھے جنھوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، کیونکہ سرسید کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ:

''مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، سماجی پستی اور احساس کمتری سے نکالنے اور ان کا کھویا ہوا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے علوم جدیدہ اور اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت ہے تاکی وہ اس کی بدولت اپنے اندر چھپے ہوئے جوہر کو اجاگر کرکے بروئے کار لاسکیں، اپنے آپکو پہچان سکیں۔ جہاں بقول اقبال خدا بندے سے اس کی رضا پوچھتا ہے گویا سرسید نے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کی دکھتی ہوئی رگ کو چھولیا تھا۔ جس پر کسی اور مصلح قوم کی نظر نہیں پڑی تھی۔''

(زینت بشیر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص۔ 10)

سرسید احمد خاں کے تعلیمی اور اصلاحی مشن میں ان کے رفقاء نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا اور قوم کو ذلت و پستی سے نکالنے کے لئے ان کے ذہنوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء خاص میں مولوی ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ اور سید ممتاز علی وغیرہ شامل ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعے جب مردوں کی تعلیم کا بیڑہ اٹھایا گیا تو مغربی اثرات کو قبول کرتے ہوئے چند روشن دماغ لوگوں نے ہندوستان میں تعلیم نسواں کو عام کرنے کی مستحکم کوشش کی اور خواتین کی آزادی اور ان کے حقوق کے حوالے سے بہت سی تحریکات کا جنم ہوا۔ کئی تعلیمی ادارے قائم کیئے گئے اور سماجی زندگی میں اصلاح و ترقی حاصل کرنے کی غرض سے متعدد انجمنیں، تنظیمیں بھی وجود میں لائی گئیں۔

مسلمانوں میں نذیر احمد ایسے پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلم

معاشرہ کی عورتوں کی خستہ حالی کو محسوس کیا اور انیسویں صدی میں پہلے پہل اپنے ناولوں کے ذریعے خواتین کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا۔ ویسے ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی خواتین کے مسائل جیسے تعداد ازدواج، نکاح بیوگان اور تعلیم نسواں جیسے موضوعات پر برابر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔

سرسید کی طرح نذیر احمد کا مقصد بھی قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ چنانچہ اپنے اس اصلاحی مشن کو پایہ تکمیل تک پہچانے کے لئے نذیر احمد نے ناول جیسی صنف کا انتخاب کیا اور اس کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کے معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی اقدار کی ترجمانی کی۔ خصوصاً اپنے ناولوں کے ذریعے انھوں نے مسلم معاشرہ کی عورتوں میں ذہنی بیداری پیدا کی اور سماج میں خواتین کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے بالخصوص ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' جیسے ناول تصنیف کیے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' 1869 میں لکھا جسے اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے نذیر احمد نے نہ صرف اپنی بیٹیوں کی اصلاح کے لئے تحریر فرمایا بلکہ عام خواتین کی اصلاح کی غرض سے لکھا تھا۔ نذیر احمد ''مراۃ العروس'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جب انھیں حسب منشا کوئی ایسی کتاب نہ ملی جو اخلاق و نصائح سے معمور ہو اور ان معاملات کو بیان کرتی ہو جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں اور جس کے پڑھنے سے ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب ہو اور جس کا پیرایہ ایسا دلچسپ ہو کہ ان کا دل نہ اکتائے۔''

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو(جلد چہارم حصہ دوم ص۔ 1141)

''مراۃ العروس'' کا موضوع ہی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس ناول میں اکبری اور اصغری دو مرکزی کردار ہیں۔ یہ دونوں کردار بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حالانکہ اکبری اور اصغری دونوں بہنیں ہیں لیکن ان میں کہیں سے کہیں مماثلت کا کوئی پہلو نہیں۔ اکبری جو بڑی بہن ہے وہ بہت زیادہ بدمزاج اور نہایت پھوہڑ لڑکی ہے جسے پڑھنے لکھنے اور امور خانہ داری میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ کمتر لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا اور ان سے دوستی کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے، یہاں تک کہ شادی کے بعد بھی اس کی عادتوں میں کوئی بدلاؤ دیکھنے کو نہیں ملا، وہیں ساس نند کے ساتھ برابر تاؤ اور شوہر کی بالکل پرواہ نہ کرنا۔ اس کے برعکس اس کی چھوٹی بہن اصغری نہایت نیک، وفادار اور سگھڑ لڑکی ہے۔ اس کے کردار کے ذریعے مصنف نے خواتین میں تعلیم اور اسکی ضرورت سے متعلق فکر و عمل کا پیغام پہنچانے کی بھرپور سعی کی۔

نذیر احمد دلی کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انھوں نے بالخصوص مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور ان کے سماجی و معاشی برائیوں اور مسائل کی تصویر کشی بہت ہی واضح انداز میں کی۔ اپنے ہم عصروں میں نذیر احمد ہی نے سماج میں عورتوں کی زبوں حالی کے درد کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور معاشرے میں ان کی خستہ و ناگفتہ بہ حالت کو دور کرنے کی غرض سے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ 1869 میں مولوی نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' لکھ کر مسلمان عورتوں کے اندر ذہنی بیداری پیدا کی اور ان کو تعلیم کی اہمیت و افادیت سے اجاگر کیا۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے مذہبی تعلیم کے ساتھ دینوی تعلیم حاصل کرنے پر بھی زور دیا۔ کیونکہ ان کا نظریہ تعلیم یہ تھا کہ صرف لڑکیوں کے لئے پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کو ایسی تعلیم فراہم کی جائے جس سے وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو بآسانی پورا کرسکیں۔

نذیر احمد کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ گھریلو نظام کو درستگی کے ساتھ چلانے کے لئے عورتوں میں بہت سی صفات کا ہونا ضروری ہے اور اس ضمن میں وہ عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ہی عورت اپنی تمام ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دے سکتی ہے اور سماج کی نظر میں ایک اچھی ماں، وفا شعار بیوی اور فرمانبردار بیٹی ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ''مراۃ العروس'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''علم کے لئے جو قوتیں درکار ہیں مرد اور عورت دونوں میں برابر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خدا نے جاہل رہنے کے لیے نہیں بنایا۔ جس حالت میں ہماری عورتیں اب ہیں اس کے لئے ان میں اتنی عقل کی کیا ضرورت ہے۔ بس خدا نے جن عورتوں کو اتنی ساری عقل دی ہے ضرور کسی بڑے کام کے لئے دی ہے یعنی علم حاصل کرنے کے لیے۔''

(فہمیدہ کبیر، بحوالہ اردو ناول میں عورت کا تصور ص 29)

نذیر احمد نے اپنے ناول ''بنات النعش'' کے ذریعے عورتوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس ناول میں ''حسن آرا'' کے کردار کے ذریعے تعلیم کی اہمیت و افادیت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں نذیر احمد کے تعلیمی تصورات کو بہت ہی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حسن آرا کا تعلق ایسے گھرانے سے ہوتا ہے

جہاں وہ تربیت پاکر بہت زیادہ بدمزاج اور بدتہذیب ہوجاتی ہے چنانچہ جب اس کو شاہ زمانی بیگم کے صلاح ومشورے کے مطابق اصغری بیگم کے مکتب میں داخل کیا جاتا ہے تو حسن آرا کی زندگی میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور اصغری جیسی ہونہار اور تعلیم یافتہ لڑکی کی صحبت میں رہ کر وہ آہستہ آہستہ تہذیب دار سگھڑ اور سنجیدہ ہوجاتی ہے۔ ''بنات النعش'' کے ذریعے ناول نگار نے جہاں تعلیم نسواں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا وہاں انھوں نے عورتوں کو جدید تعلیم خصوصاً معلومات عامہ سے بھی روشناس ہونے کی تلقین کی۔ انھوں نے اس ناول میں سائنسی مضامین کو نہایت ہی دلکش پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، خردبین، علم جرثقیل، رنگوں کی خصوصیت اور مقناطیس وغیرہ۔

نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے نہ صرف تعلیم نسواں جیسے موضوع پر بحث کی بلکہ ایسے بہت سے مسائل پر اظہار خیال کیا جو اس عہد میں عورتوں کی ترقی میں حائل تھے مثلاً شادی کا مسئلہ، بیواؤں کی قابل رحم حالت، نکاح بیوگان اور پردہ کی پابندی وغیرہ۔ نکاح ثانی کے مسئلہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے نذیر احمد نے ''فسانہ مبتلا'' جیسا اصلاحی ناول تصنیف کیا اور اس امر پر اظہار خیال کیا کہ حقوق اسلام کی روشنی میں بیواؤں کو دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اپنی قابل رحم حالت کو درست کرسکیں۔ یہی نہیں بلکہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں اس عہد کی ہندو تہذیب کے اثرات سے متاثرہ عورت کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔

الطاف حسین حالی:

رفقائے سرسید میں حالی ایسے شخص ہیں جنھوں نے اردو ادب کو مختلف جہتوں سے روشناس کیا۔ ناول نگاری کی صنف میں نذیر احمد کے بعد الطاف حسین حالی نے ''مجالس النساء'' جیسا اصلاحی ناول لکھکر اردو نثر میں اپنا نام روشن کیا۔ اس ناول کو 1874 میں تصنیف کیا گیا۔ کیونکہ حالی کو سرسید سے دلی لگاؤ تھا اس لئے سرسید کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر حالی نے بھی تعلیم کی اہمیت وافادیت کو سمجھا اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم کی جانب متوجہ ہونے کی ترغیب دی تاکہ وہ زیور تعلیم سے آراستہ ہوسکیں، کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ہماری قوم اس وقت تک ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہوسکتی جب تک عورتوں کو تعلیم یافتہ نہ کیا جائے اور سماج سے بے جا رسومات کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ قوم سے لڑکیوں کو تعلیم دینے کی اپیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ساری قوم سے میری غرض ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور ان کو جو خدا تعالیٰ نے جوہر قابل دیا ہے اس کو خاک میں نہ ملائیں اور ان کو پڑھانے لکھانے میں جو ہزاروں فائدے ان کے اور عورتوں کے لیے ہیں، انھیں مفت برباد نہ کریں۔''

(وحید کوثر، بحوالہ اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات۔ص 194)

تعلیم نسواں کے سلسلے میں حالی کا نقطۂ نظر سرسید سے ذرا مختلف نظر آتا ہے۔ سرسید کا نظریہ یہ تھا کہ جب قوم کے مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو وہ خود اپنی عورتوں کی تعلیم کی طرف دھیان دیں گے۔ لیکن حالی پہلے سے ہی عورتوں کو تعلیم دلانے کے حق میں تھے۔ اپنے اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے ''مجالس النساء'' تصنیف کی۔ حالانکہ ''مجالس النسا'' مولوی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' کے پانچ برس بعد لکھا گیا لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ عورتوں کی تربیت اور ان میں تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کرنا۔ بس اتنا فرق ہے کہ نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' اپنی بچیوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے تصنیف فرمائی جبکہ حالی نے ''مجالس النساء'' پوری قوم کی بچیوں اور عورتوں کی تعلیم وتربیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریر کی۔ یہی نہیں بلکہ حالی نے اپنی ذاتی کوششوں سے اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک چھوٹا سا مدرسہ نسواں بھی قائم کیا جہاں لڑکیوں کو نصابی تعلیم کے ساتھ مذہبی علوم اور امور خانہ داری کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

حالی کی تصنیف کردہ کتاب ''مجالس النساء'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور زندگی میں تعلیم کی اہمیت وافادیت اور اسکی ضرورت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ماں اپنے لڑکے کو کس طرح عمدہ تعلیم وتربیت دے سکتی ہے۔ ''مجالس النساء'' کے دونوں حصوں میں حالی کے اسی خیال کی ترجمانی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ ان کا بنیادی حق ہے۔ ایک موقع پر مولانا حالی آتو جی کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں:

''ان کے یہاں لڑکیوں کے پڑھانے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔ وہیں لڑکیاں جب بیاہی گئیں اور صاحب اولاد ہوئیں، انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دینا شروع کیا یہی تو بات ہے جو ان کے عورتوں میں عورتیں اور مردوں میں مرد سب ایک سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔۔۔بغیر ماں کی تعلیم کے کسی کو آدمیت نہیں آسکتی۔''

(وحید کوثر، اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات، ص 195-194)

یوں تو سرسید کے رفقاء اور ان کے معاصرین میں تقریباً سبھی نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے معاشرہ میں خواتین کی تعلیم اور ان کی اصلاح و ترقی کا بیڑہ اٹھایا لیکن بالخصوص مولانا حالی نے بچیوں اور عورتوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی نیز سماج میں انکی ابتر حالت کو بہتر بنانے کے لئے لڑکیوں میں تعلیم کی تحریک شروع کی۔

حالی نے تعلیم نسواں کے علاوہ سماج میں خواتین کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ حالی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عورتوں کے جذبات واحساسات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنی شاعری میں جگہ دی اس سے حالی کے دل میں عورت کے تئیں ایثار ومحبت اور جذبۂ ہمدردی کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو نظمیں ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ حالی نے مناجات بیوہ کے ذریعے بیوہ کی دردناک حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی دردناک رنج وغم اور مصیبت ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ بیوہ عورت اللہ سے مناجات کرتے ہوئے جو بیان کرتی ہے اسے حالی سے سنیئے:

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری
دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جاں کی دشمن
جاں پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بے زار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منھ میں بول نہیں ہیں اتنے
کوئی نہیں دل کا بہلاوا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

الطاف حسین حالی کی دوسری مشہور نظم ''چپ کی داد'' میں عورت کی مظلوم زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کی اس کی دردبھری اور اذیت ناک داستان ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور جسے پڑھ کر قاری کے دل میں اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس میں عورت کی سماجی ومعاشرتی زندگی کے تمام مصائب کا ذکر زیر بحث آیا ہے کہ اس عہد میں آدمیوں نے کس طرح عورتوں کو اپنی بربریت کا شکار بنایا ہوا تھا اور سماج میں سرے سے ان کا اپنا کوئی مقام یا وجود ہی نہیں تھا۔

ناخواندگی کے سبب سماج میں عورت کی نہایت المناک اور بدتر حالت تھی اور مردوں نے خواتین کو ان کے ذاتی حقوق سے محروم کر رکھا تھا اس کے بارے میں حالی فرماتے ہیں:

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسے بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

حالی نے عورتوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد ہی تمہارے ساتھ سماج میں ہونے والی حق تلفیوں اور برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ حالی نے عورتوں میں بیداری واصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور انھیں اس بات کی امید دلائی کہ تعلیم کے رواج پانے سے تمھیں جلد ہی کامیابی نصیب ہوگی۔ کہتے ہیں:

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی، سچائی ہی نے آخر پائی ہے

علامہ شبلی:

شبلی اردو ادب میں ایک ممتاز ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس سے بڑھکر وہ عظیم رہنما اور مصلح بھی تھے جنھوں نے قوم میں ذہنی بیداری لانے کی غرض سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن جب شبلی کی ملاقات سرسید سے ہوئی تو ان کی صحبت میں رہ کر شبلی کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے۔

شبلی کو جب سرسید کی تعلیمی تحریک کی فضا نصیب ہوئی تو انھوں نے بھی دوسرے علماء کی طرح قوم میں تعلیم کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ایک عالم ومفکر کی حیثیت سے وہ مسلمان قوم میں تعلیمی ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے فکر مند رہتے۔ شبلی نے قوم کے بچوں کے علاوہ بچیوں اور خواتین کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی۔ رفقاء سرسید میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی کی طرح شبلی بھی تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور مبلغ تھے۔ وہ عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے کے دل سے خواہاں تھے۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے وہ عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں قید کرنے کے قائل نہیں تھے۔

اسلامی حدود کے دائرے میں شبلی نے پردے کی حمایت کی لیکن وہ خواتین میں ایسے پردے کے قائل نہیں تھے جو ان کی تعلیمی وتہذیبی زندگی

میں رکاوٹ کا سبب بنے۔ ان کا نظریہ تھا کہ خود عورتیں جب تک سماج میں اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتیں اس وقت تک مردان کے حقوق ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔ اس حوالے سے عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط تحریر کیا جس میں یوں رقم طراز ہیں:

''عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دینوی اور معاشی علوم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کھائیں اور کمائیں، لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے، اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔''

(شمس بدایونی: شبلی کی ادبی وفکری جہات۔ ص 107)

شبلی مسلم خواتین کو غیر مسلم خواتین کی طرح کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اور عورتوں کے لئے ایسی تعلیم حاصل کرنے کو ضروری خیال کرتے تھے جس سے وہ معاشی طور پر اپنی حالت کو مردوں کے مقابلے بہتر بنا سکیں۔ ان کا ماننا تھا کہ عورتیں جب تک خود مختار نہیں ہوں گی وہ معاشرہ میں سماجی و سیاسی اور اخلاقی حقوق حاصل نہیں کر سکیں گی۔ شبلی چاہتے تھے کہ غیر مسلم خواتین کی طرح مسلم خواتین بھی اپنا تعلیمی معیار قائم کریں۔ اس حوالے سے عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریزی اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔''

(صادقہ ذکی، بحوالہ ادب خواتین اور سماج۔ ص 40)

خواتین کے نصاب کے تعلق سے علامہ شبلی کا خیال تھا کہ مرد اور عورت دونوں کا تعلیمی نصاب ایک ہونا چاہئے تاکہ وہ مردوں کی تعلیم کی طرز پر خود بھی تعلیم حاصل کر کے سماج میں ایک نمایاں و منفرد مقام حاصل کریں۔ 26 مئی 1909 کو عطیہ فیضی کے نام خط لکھ کر اپنے اس خیال کی ترجمانی ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''نصاب تعلیم سے متعلق میں سرے سے اس بات کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے۔۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں مختلف نوع ہو جائیں گے۔ البتہ بعض چیزیں مثلاً رضائیت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے لئے نصاب میں اضافہ ہونے چاہئے۔''

(شمس بدایونی۔ بحوالہ شبلی کی ادبی وفکری جہات، ص 107)

بالآخر خواتین کی تعلیم، آزادی فکر اور حقوق کے حوالے سے شبلی نے اپنے جن خیالات و افکار کی ترجمانی کی اور اس سلسلہ میں عطیہ بیگم فیضی کے نام جو خط لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں تعلیم نسواں کے پرزور مبلغ رہے۔ جنھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی اسکول یا شعبہ تو قائم نہیں کیا لیکن اس عہد میں عورتوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق جو رسائل شائع ہوا کرتے تھے ان میں اپنی تحریروں کے ذریعے تعلیم نسواں کو برابر تقویت بخشتے رہے۔ جس سے آزادی نسواں اور تحریک نسواں کو منظم ہونے میں مدد ملی۔

مولوی ذکاءاللہ:

مولوی ذکاءاللہ سرسید کے رفیق خاص تھے۔ حالانکہ ذکاءاللہ کا تعلق دہلی کالج سے تھا نیز امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر جیسے اساتذہ کی زیر نگرانی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ چونکہ ذکاءاللہ کو سرسید سے گہری وابستگی تھی اور ان کی قابلیت اور کارناموں کے دل سے خواہاں تھے، اسی کی بناء پر بہت جلد ذکاءاللہ کا شمار ان کے رفقاء خاص میں کیا جانے لگا۔

ادب میں ذکاءاللہ کی حیثیت ایک مورخ کی رہی ہے، لیکن انھوں نے ریاضی، سائنس اور جغرافیہ سے متعلق موضوعات پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ذکاءاللہ کو تعلیم سے خاصی دلچسپی تھی اس کی نسبت انھوں نے دو باتوں پر خاص زور دیا ایک تو یہ کہ تعلیم مادری زبان (Mother TOngue) میں ہونی چاہئے، دوسری یہ کہ بچوں کی تعلیم اس طرز پر کی جانی چاہئے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی بہتر پرورش کر سکیں۔ سرسید کے دوسرے رفقاء کی طرح ذکاءاللہ نے بھی اپنے دور میں تعلیم نسواں کی زبردست حمایت کی۔ جس کے صلہ میں انھیں 1864 میں پہلا اعزاز عطا ہوا۔ تعلیم نسواں سے متعلق ذکاءاللہ کی کوششوں کے اعتراف میں سرکار نے ایک بیش بہا خلعت اور خاں بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ ذکاءاللہ نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے ذاتی طور پر کوششیں کیں اور اس سلسلے میں اس عہد کے رسائل میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔

عورتوں کی تعلیم سے متعلق ذکاءاللہ کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اصغر عباس لکھتے ہیں:

''رفقائے سرسید میں مولوی ذکاءاللہ بھی لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ خواتین کے حال زار پر رسائل و جرائد میں ان کے مضامین آج بھی اثر رکھتے ہیں۔ انھوں نے بلند شہر میں بیواؤں کے لئے ایک اسکول بھی کھولا تھا۔ ذکاءاللہ کے سوانح نگار سی۔ ایف۔ آئنڈریوز نے لکھا ہے کہ وہ شمالی

ہند میں تعلیم نسواں کے اولین حامیوں میں سے تھے۔ ایسے
زمانے میں جبکہ ایسی چیز کا تخیل بھی عامۃ الناس کی نظر میں
اجنبی اور عجیب وغریب سمجھا جاتا تھا۔"

(تہذیب الاخلاق، اکتوبر 2014، جلد 33 شمارہ 10، ص 127)

اس وقت ذکاءاللہ کو عورتوں میں تعلیم کی کمی کا شدید احساس تھا اس لئے انھوں نے تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور چاروں طرف اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ عورت کی گود ہی وہ پہلی تربیت گاہ ہے جہاں آنے والی نسلیں تربیت پاتی ہیں۔

خود ذکاءاللہ کی بہو ایک تعلیم یافتہ روشن خیال خاتون تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب تعلیم سے متعلق بیگم شیخ عبداللہ کے گھر صلاح ومشورے ہوتے تھے اور اس وقت جو خواتین شرکت کرتی تھیں ان میں ذکاءاللہ کی بہو بھی شامل تھیں۔ انھوں نے اپنی بہتر کارکردگی سے خواتین میں تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ذکاءاللہ کے دل میں عورت کے لئے جو ایک خاص مقام اور عزت ہے اس کا اندازہ ان کے تحریر کردہ مضمون "گھر کی تربیت" سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں لکھتے ہیں:

"عورت اس لئے نہیں بنائی گئی کہ وہ بے عقل اور نافہم رہ کر
مرد کی خدمت یا مزدوری کرے یا ایک سہانا کھلونا بن کر وقت
فرصت اس کا دل خوش کرے۔" (ایضاً)

مولوی ذکاءاللہ کا ماننا تھا کہ تعلیم کے میدان میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی حقوق فراہم کیے جائیں اس حوالے سے اپنی بات کو ان جملوں میں ختم کرتے ہیں:

"عورتوں کی پاکیزگی اخلاق اور تربیت مردوں کی اخلاقی
خصلت اور عقلی قوت کی بڑی ملجا وماوی ہیں جیسے یہ دونوں مل کر
اپنے قوی کو کامل طور پر ظاہر کریں گے ویسا ہی قوم کا انتظام زیادہ
عمدہ ہوگا اور برتری واقبال مندی یقینی ہوگی۔" (ایضاً)

1878 میں سرسید کے رفیق خاص ممتاز علی نے بھی تعلیم نسواں کی تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ ممتاز علی کو سماج میں عورتوں کی زبوں حالی کا شدید احساس تھا نیز وہ معاشرہ میں مرد وعورت کے درمیان مساوات کے قائل نظر آتے ہیں۔ اپنے انھیں خیالات کی عکاسی وترجمانی کے لئے ممتاز علی نے "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سماج میں عورتوں کی اصلاح کے پیش نظر ایک کتاب "حقوق نسواں" کے نام سے تصنیف کی۔ یہ کتاب 1898 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے منطقی طور پر گفتگو کی گئی ہے۔

سید ممتاز علی نے تعداد ازدواج کی بھی مخالفت کی۔ یہاں وہ چراغ علی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ چراغ علی نے بھی عورتوں کی تعلیم کو سراہا۔ یہ تعلیم نسواں کو وقت کی ایک بڑی اور اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ چراغ علی کا کہنا تھا کہ خواتین کو ان کی زندگی میں تعلیم حاصل کرنے کے بہتر مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوکر اپنی آنے والی نسلوں کو روشن مستقبل عطا کرسکیں۔

رفقائے سرسید کے علاوہ علی گڑھ کالج سے فارغ ہوئے طلبہ مثلاً شیخ عبداللہ، خواجہ غلام الثقلین اور آفتاب احمد وغیرہ نے اپنے عہد میں تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی ان میں سب سے زیادہ سرگرم شیخ عبداللہ رہے۔ انھوں نے عورتوں میں ذہنی وتعلیمی بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے 1904 میں رسالہ "خاتون" بھی جاری کیا اور اپنے مضامین کے ذریعے خوابیدہ ذہنوں کو جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ تحریک تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے سرسید کے شاگرد شیخ عبداللہ اور ان کی شریک حیات بیگم شیخ عبداللہ نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔ ان کی اس دل جوئی، محنت اور لگن کے سبب اس تحریک نے بہت جلد ایک ملک گیر تحریک کا درجہ اختیار کرلیا۔

سرسید کے معاصرین اور دائرہ جماعت میں تقریباً سبھی تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں سرگرم عمل نظر آرہے تھے۔ ایسے لوگ کافی بڑی تعداد میں موجود تھے جنھوں نے اپنے عہد میں عورتوں کی تعلیم کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی۔ بالخصوص عہد سرسید سے لے کر بیسویں صدی تک اردو ادب کے مختلف اصناف میں تعلیم نسواں کا موضوع زیر بحث رہا۔ نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں کی طرز پر سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، مولوی بشیر الدین، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند وغیرہ نے اپنے ناولوں کی راہ استوار کی نیز تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے تعلق سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

□□□

Hadisa Afzal
H.No. 3311 Farhatullah Street
Kucha Pandit
Lal Kuan, Delhi-110006

خواجہ عبدالمنتقم

اقلیتی طبقات کی خواتین کی اختیارکاری کا سرکاری منصوبہ

حکومت ہند کی وزارت اقلیتی امور نے اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے اور انھیں بااختیار بنانے کے لیے ایک نئی اسکیم "Scheme for Leadership Development of Minority Women" شروع کی ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے ”ہمارے ملک میں خواتین، خصوصاً سماج کے محروم طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بہ لحاظ مرتبہ کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اہل خانہ بھی افراد خانہ کو فراہم کی جانے والی سہولیات کے معاملے میں بچیوں کے ساتھ امتیاز برتتے ہیں۔ یہ امتیاز ان کی پیدائش سے قبل اور پیدائش کے بعد، حسب صورت، غذا، تعلیم، طبی نگہداشت جیسے ہر شعبہ میں برتا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سن بلوغ کی حد میں داخل ہوتے ہی ان کی جلد از جلد شادی کردی جاتی ہے۔ دیہی خواتین کو تو کام کاج کے معاملے میں دوہری مار جھیلنی پڑتی ہے۔ دیہاتوں میں جہاں خواتین کو کھانا پکانے، پانی بھر کر لانے، بچوں کو اسکول بھیجنے، کھیتوں میں کام کرنے، مویشیوں کو چارہ دینے، دودھ دوہنے وغیرہ جیسی کم نظر آنے والی ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں وہیں مرد ایسے کام کرتے ہیں جو سب کو نظر آتے ہیں جیسے دودھ اور اپنا غلہ فروخت کرنا۔ جہاں تک اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کا سوال ہے وہ بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ صرف ایک اقلیت ہی نہیں بلکہ ”حاشیہ پر پہنچائی گئی بے اختیار اکثریت“ (Marginalised majority) ہیں۔ یہاں تک کہ خانگی معاملات میں فیصلہ لیتے وقت بھی انھیں نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ انھیں سماجی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لینے اور سماجی مراعات وانعامات میں برابر کی حصہ داری سے محروم رکھا جاتا ہے۔“

اس دستاویز میں یہ بات واضح الفاظ میں کہی گئی ہے کہ خواتین کی اختیارکاری سے صرف جنسی انصاف کے تقاضے ہی پورے نہیں ہوتے بلکہ اس سے غریبی بھی دور ہوگی اور اقتصادی عمل کو مزید استحکام حاصل ہوگا۔ غربت وافلاس کے شکار کنبوں میں حالات کی مار زیادہ تر خواتین اور بچوں کو ہی جھیلنی پڑتی ہے۔ ایسے حالات میں انھیں امداد فراہم کرنا ضروری ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانا اور خصوصاً ماؤں کے ہاتھ مضبوط کرنا اور بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ گھروں میں انھیں نہ صرف یہ کہ بچوں کو پالنا پوسنا ہوتا ہے بلکہ ان کی حیثیت ایک ایسی بھٹی کی سی ہے جس میں تپ کر ان کے بچوں کا کردار نکھر کر سامنے آتا ہے یا یہ کہئے کہ وہ اپنے بچوں کی تعمیر کردار میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

وزارت اقلیتی امور جن اقلیتی طبقات کے لیے سرگرم عمل ہے وہ ہیں مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ اور پارسی۔ قومی اقلیتی کمیشن ایکٹ، 1992 کی دفعہ 2(ج) کے تحت انہی طبقات کو نوٹیفائی کیا گیا ہے۔ انہی طبقات کی اہل خواتین ٹارگیٹ گروپ قرار دی جائیں گی۔ منصوبے میں یہ بھی تجویز ہے کہ سماج میں کثرت الوجود کی جو رنگارنگ تصویر ابھر کر آئی ہے اس میں مزید رنگ بھرنے کے لیے اور اقلیتوں کی بہبود کے لیے کی جانے والی کاوشوں میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے منصوبوں میں کم سے کم 25 فیصدی ایسی خواتین کو شامل کیا جانا چاہیے جن کا تعلق اقلیتی طبقات سے نہ ہو۔ ہر تنظیم یہ کوشش کرے کہ 25 فیصدی گروپ کے تحت درج فہرست ذاتوں/درج فہرست قبائل/دیگر پسماندہ ذاتوں سے

تعلق رکھنے والی خواتین/معذور خواتین اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین پر مشتمل نمائندہ گروپ تشکیل دیا جائے اور پنچایت راج اداروں کے تحت کسی بھی طبقے کی منتخب خواتین نمائندوں کو تربیت حاصل کرنے کے لیے راغب کیا جائے۔

اسکیم کی اغراض

کسی بھی دیہات یا دیہاتی علاقے میں رہنے والی اقلیتی طبقات کی خواتین، جن میں ان کے پڑوس میں رہنے والی دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی شامل ہیں، قائدانہ صلاحیت کے فروغ کی اسکیم کا مقصد ہر سطح پر انھیں معلومات، امدادی ساز وسامان اور تکنیک فراہم کر کے بااختیار بنانا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا ہے تاکہ وہ ہر سطح پر سرکاری اداروں، بینکوں اور بچولیوں سے رابطہ قائم کر کے ان سے معاملات طے کر سکیں۔ روایتی طور پر ان میں سے بیشتر خواتین کی زندگی روزمرہ کی مشقت کے سوا کچھ بھی نہیں اور ان کی مشکلات میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب انھیں شہری/بنیادی سہولیات فراہم کرنے اور ان کے لیے مناسب سماجی واقتصادی حالات پیدا کرنے کے لیے نہ تو کوئی بنیادی ڈھانچہ فراہم کیا جاتا ہے اور نہ ہی ضروری خدمات۔ جب تک خواتین اپنے حقوق کے لیے خود نہیں لڑیں گی تب تک ان کی مشکلات میں جلد کمی آنے کی امید نہیں ہے۔ اس اسکیم کے تحت اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ غیر سرکاری تنظیموں (این جی او)/اداروں کے توسط سے ان تک رسائی حاصل کی جائے۔ ان غیر سرکاری تنظیموں/اداروں کو قائدانہ صلاحیت کے فروغ سے متعلق تربیت دینے کے لیے مالی امداد فراہم کرائی جائے گی تاکہ اقلیتی طبقات کی خواتین کو بااختیار بنایا جا سکے اور ان میں اتنی ہمت پیدا کی جا سکے کہ وہ اپنے گھروں اور کمیونٹی کی حدود سے باہر نکلیں اور قائدانہ کردار ادا کریں۔ نیز اجتماعی یا انفرادی طور پر اپنے حقوق کی دعویداری پیش کر سکیں اور تمام خدمات سہولیات، مہارتوں (تکنیکی کاموں) اور مواقع تک ان کی رسائی ہو۔ اس کے علاوہ وہ اپنی زندگی اور حالات زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ملک کی ترقی کے باعث آئی خوشحالی میں برابر کا شریک ہونے کا دعویٰ پیش کر سکیں۔

اقلیتوں کے مختلف طبقات سے متعلق تنظیمیں/غیر سرکاری تنظیمیں/دیگر تنظیمیں/ادارے

اقلیتی طبقات کی خواتین میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے سے متعلق اسکیم میں جس تربیتی/امدادی خدمات (Nurturing/hand holding service) پر زور دیا گیا ہے وہ حمایت واستدلال (Advocacy) سے جڑی ہوئی ہیں اور اس کے لیے فیلڈ میں جا کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ٹارگیٹ گروپ کے لیے ہمیشہ سہولت کار (Facilitators) موجود رہیں اور ان کا برابر ہاتھ بٹائیں۔ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والی تنظیم کے عملے کو وقتاً فوقتاً دیہاتی علاقوں کا دورہ کرنا ہوگا تاکہ وہ ان خواتین کو، جنھیں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے تربیت دی گئی ہے، تربیتی/امدادی خدمات فراہم کر سکیں اور امدادی ساز وسامان اور تکنیک کو استعمال کرنے کے معاملے میں ان کی رہنمائی کر سکیں اور وہ اپنی کاوشوں کو ثمر آور بنا سکیں۔ اس پیمانے پر اس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے صرف اقلیتی طبقات سے متعلق محرک اور لگن سے کام کرنے والی تنظیمیں ہی موزوں رہیں گی۔ خواتین جن گھریلو مشاغل کو انجام دیتی ہیں ان کے لیے ان کا گھروں کے قریب رہنا ضروری ہوتا ہے اس لیے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والی تنظیموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے پاس تجربہ اور ایسے افراد اور وسائل موجود ہوں جن کی مدد سے وہ خواتین کو اپنے علاقہ میں ٹریننگ فراہم کرا سکیں۔ کسی بھی ایسی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس پہلے سے ہی اس قسم کا تجربہ اور وسائل موجود ہوں جن کی بدولت وہ کسی ایسے تسلیم شدہ سرکاری ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں خواتین کے لیے اقامتی تربیت کا انتظام کر سکیں جو ان کی تعلیمی ضروریات پوری کر سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کام میں صرف انہی محرک اور لگن سے کام کرنے والی تنظیموں کو اہل شرکت سمجھا جائے جن کی متعلقہ طبقات تک رسائی ہو اور ان کے پاس ضروری وسائل وافرادی قوت ہو تاکہ وہ دیہاتوں/علاقوں میں خواتین کو اس قسم کی تربیت دے سکیں اور کسی تسلیم شدہ سرکاری تربیتی ادارے میں ان کے لیے اقامتی تربیتی کورس کا انتظام کر سکیں۔

اس اسکیم کے تحت غیر سرکاری تنظیموں کے علاوہ جو تنظیمیں/ادارے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے درخواست دینے کے اہل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(i) سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ، 1860 کے تحت قائم کی گئی کوئی سوسائٹی۔

(ii) فی الوقت نافذ کسی بھی قانون کے تحت رجسٹرڈ کوئی پبلک ٹرسٹ۔

(iii) کمپنیز ایکٹ، 1956 کی دفعہ 25 کے تحت لائسنس یافتہ چیریٹیبل کمپنی اور

(iv) یونیورسٹیاں/اعلیٰ تعلیم ادارے۔

(v) پنچایتی راج ادارے۔

عمل درآمدگی

اس تربیتی اسکیم کو وزارت اقلیتی امور مختلف تنظیموں کے توسط سے

عملی جامہ پہنائے گی۔ منتخب تنظیمیں اس منصوبے کو اپنے تنظیمی ڈھانچے کے ذریعے براہ راست عملی شکل دے سکتی ہیں یا متعلقہ علاقے/دیہات/حلقے میں سرگرم چھوٹی چھوٹی تنظیموں سے تعاون حاصل کرسکتی ہیں۔

ٹریننگ ماڈیول

قائدانہ صلاحیت کے فروغ سے متعلق ٹریننگ ماڈیول کے تحت ان تمام مدعوں اور حقوق کا احاطہ کیا جائے گا جو آئین اور مختلف قوانین کے تحت آتے ہیں اور جن کا تعلق خواتین، تعلیم، روزگار، ذریعۂ معاش وغیرہ کے ساتھ ساتھ ان مواقع، سہولیات اور خدمات سے بھی ہے جنھیں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں تعلیم، صحت، حفظان صحت، تغذیہ (Nutrition)، مامونیت (Immunization)، خاندانی منصوبہ بندی، بیماریوں پر کنٹرول، سستے سامان کی فراہمی، پینے کے پانی وبجلی کی فراہمی، صفائی ستھرائی، ہاؤسنگ، اپنا روزگار، اجرت/مزدوری، ہنرمندی سے متعلق تربیتی مواقع، خواتین سے متعلق جرائم وغیرہ کے تعلق سے فراہم کریں۔ اس کے احاطے میں پنچایتی راج اور نگر پالیکا میں خواتین کا رول، خواتین کے قانونی حقوق، حق اطلاعات ایکٹ، قومی دیہی روزگار پروگرام (Nrega)، گھریلو سروے اور خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے افراد کی فہرست، سرکاری ادارے، ان کا کام کاج، ملازمین کی شکایات کے ازالہ سے متعلق فورم اور میکانیزم وغیرہ آتے ہیں۔ ٹریننگ ماڈیول کی اس طرح تشکیل کی جائے کہ تربیت سے متعلق ضروری معلومات کم وقت میں حسب ضرورت فراہم کی جاسکیں۔

ٹریننگ کے دوران پڑھاتے وقت آڈیو وژیل ایڈس اور کیس اسٹڈیز کا استعمال بھی کیا جانا چاہیے تاکہ اسے مزید دلچسپ و جامع بنایا جاسکے۔ قائدانہ صلاحیت، تنظیمی صلاحیت، عوام سے خطاب کرنے کی صلاحیت، جھگڑے نمٹانے کی صلاحیت وغیرہ جیسی صفات پیدا کرنے کے لیے تربیت دی جانی چاہئیں۔ سرگرم شمولیت کو بڑھاوا دینے کے لیے ٹریننگ پروگرام میں اجتماعی بحث ومباحثہ (Group discussion) کو بھی شامل کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو سرکاری اہلکاروں اور بینکروں وغیرہ کو بھی مدعو کیا جائے تاکہ وہ اپنی اسکیموں اور پروگراموں کے بارے میں بتائیں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی خواتین سے بات چیت کرسکیں۔

تربیت کے لیے خواتین کی شناخت ومعیار

اس اسکیم کے تحت ٹریننگ کرانے والی منتخب تنظیم کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ مقررہ معیار کے مطابق خواتین کی شناخت اور انتخاب کرکے ان میں تحریک پیدا کرے۔ حالانکہ اس اسکیم کے تحت ٹریننگ حاصل کرنے والی خواتین یا ان کے سرپرستوں کی سالانہ آمدنی پر کوئی پابندی تو عائد نہیں ہے مگر جن خواتین یا ان کے والدین یا سرپرستوں کی تمام وسائل سے سالانہ آمدنی 2.5 لاکھ روپے تک ہو انھیں ترجیح دی جانی چاہیے۔ ان کی عمر 18 سے 65 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔

قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے دو طرح کی ٹریننگ دی جائے گی۔ دونوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) دیہی علاقے میں دی جانے والی ٹریننگ: ایک بیچ میں 50 تک خواتین ہوسکتی ہیں۔ یہ ٹریننگ ان خواتین کو دی جائے گی جن میں عموماً سماج اور خصوصاً اقلیتی طبقات کی خواتین کی بہتری اور بہبود کے لیے کام کرنے کی لگن ہو اور وہ مستعدی کے ساتھ ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ 40 خواتین کی جماعت میں کم از کم 10 فیصد خواتین ایسی ہونی چاہئیں جو دسویں جماعت پاس کرچکی ہوں گی۔ اگر دسویں پاس خواتین نہ مل پائیں تو پانچویں جماعت پاس خواتین کو لیا جاسکتا ہے۔

(ب) اقامتی تربیتی اداروں میں دی جانے والی لیڈر شپ ٹریننگ: سرکاری اقامتی تربیتی اداروں میں اس ٹریننگ کے لیے 50 خواتین کی ایک جماعت میں کسی بھی دیہی علاقے سے پانچ خواتین سے زیادہ کا انتخاب نہ کیا جائے۔ ان خواتین کی کم از کم تعلیمی قابلیت گریجویشن ہونی چاہیے۔ البتہ اگر گریجویٹ خواتین دستیاب نہ ہو پائیں تو اس تعلیمی قابلیت کو گھٹا کر دسویں پاس بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان خواتین میں کام کرنے کی لگن ہونی چاہیے اور وہ جسمانی طور پر صحت مند و چست ہونی چاہئیں اور ان میں عموماً سماج اور خصوصاً اقلیتی طبقات کی خواتین کی بہتری اور بہبود کے لیے کام کرنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔

تربیت کے لیے منتخب خواتین کو بھتہ/وظیفہ دیا جائے گا تاکہ ان کی آمدنی/اجرت یا مزدوری کا کوئی نقصان ہوا ہو تو اس کو پورا کیا جاسکے یا اس کی بھرپائی کی جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ تربیت کے دوران ان کے قیام اور ان کے کھانے پینے کا بھی انتظام کیا جائے گا اور دن میں تربیتی اوقات کے دوران ان کے بچوں کے لیے کریچ کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ غیر سرکاری تنظیم کے ذریعے تربیت دینے کے لیے منتخب افراد میں کم از کم دو تہائی خواتین ہونی چاہئیں اور وہ اس بات کی اہل ہونی چاہئیں کہ وہ اس اسکیم سے متعلق موضوعات پر اس علاقے کی مقامی زبان میں اپنی بات سب کے سامنے رکھ سکیں۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ خواتین کو قائدانہ صلاحیت کے فروغ سے متعلق تربیت اس طرح دی جانی چاہیے کہ اس سے اس اسکیم کے پیرا 5 میں درج اغراض پوری ہوسکیں۔ تنظیم کم از کم ایک سال تک تربیتی/امدادی خدمات (Nurturing/hand holding) فراہم کرے گی تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ وہ خواتین جن کو اس تربیت کے ذریعے با اختیار بنانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ایک پریشر گروپ کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں اور پروجیکٹ کو ترتیب دیتے وقت دیہی علاقے میں جس بنیادی ڈھانچے اور خدمات میں خامیاں پائی گئی ہیں اس میں سدھار لانے کے لیے اپنی شکایات و مسائل، حسب صورت، گاؤں/بلاک/ضلع/ریاست کے حکام کے روبرو رکھ سکیں۔ تنظیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ وہ تربیتی/امدادی خدمات فراہم کرنے کے لیے مقرر کیے گئے سہولت کار متعلقہ دیہی علاقے میں جائیں اور جو کام انھیں سونپا گیا ہے اسے محنت سے کریں، کام کی پیش رفت کے بارے میں رپورٹ دیں اور انھیں ضرورت پڑنے پر بروقت تنظیم کی طرف سے پوری امداد ملے۔

غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے انتخاب کے لیے مطلوبہ شرائط و معیار

(الف) تنظیم باقاعدہ رجسٹرڈ ہو اور کم از کم پانچ سال سے سرگرم عمل ہو۔

(ب) تنظیم فی الوقت سرگرم عمل ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں ان تنظیموں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس اس علاقے/مقام/حلقے میں اس قسم کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا تجربہ ہو۔

(ج) ایسی تنظیم کو خواتین سے متعلق کم از کم ایک تربیتی منصوبے کو پورا کرنے کا تجربہ ہونا چاہیے البتہ ایسی تنظیموں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس خواتین، خاص کر اقلیتی طبقات کی خواتین، کے مسائل سے متعلق کام کرنے کا تجربہ ہو۔

(د) ایسی تنظیموں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس سرکاری، دوفریقی و کثیر فریقی مالیاتی ایجنسیوں/اداروں یا اقوام متحدہ کے ذریعے فراہم کردہ مالی وسائل سے پورا کیے جانے والے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا تجربہ ہو۔

(ہ) تنظیم کا سالانہ بجٹ کم از کم ایک کروڑ ہونا چاہیے اور یہ گذشتہ تین سال میں کم از کم اتنا ہی رہا ہو اور تنظیم کو کسی خسارے کا سامنا نہ ہو۔

(و) تنظیم کا گذشتہ تین سال کا سالانہ حساب کتاب اور سالانہ رپورٹیں تیار ہونی چاہئیں اور حساب کتاب کا باقاعدہ آڈٹ ہو چکا ہو۔

(ز) تنظیم نے قانونی اعتبار سے ضروری تمام اجلاس کا انعقاد کیا ہو۔

(ح) تنظیم کو ریاست/یونین علاقے میں اذیلی ریاستی سطح پر اپنے موجودہ تنظیمی ڈھانچے (Set up) کی تفصیل دینی ہوگی۔

(ط) تنظیم کو سرکار کے ذریعے چلائے جانے والے تربیتی اداروں کے ساتھ اپنے اشتراک کی بھی تفصیل دینی ہوگی۔

(ی) تنظیم کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس نے اس علاقے میں کوئی تربیتی کورس چلایا ہو۔

(ک) تنظیم کے پاس ایسا ضروری عملہ ہونا چاہیے جس کے پاس یہ صلاحیت ہو کہ وہ خواتین میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے سے متعلق تربیت دے سکے، ان کے مسائل کو صحیح طور پر سمجھ سکے اور تربیتی/امدادی کارروائی جیسے کام انجام دے سکے۔

(ل) اس اسکیم کے لیے تنظیم کے فیلڈ ورکروں/سہولت کاروں (Facilitators) میں سے کم سے کم دوتہائی ایسی خواتین ہونی چاہئیں جن کے پاس اس قسم کا کام کرنے کا تجربہ ہو۔

(م) تنظیم کو اس قسم کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق اپنی معتبریت اور اہلیت ثابت کرنے کے لیے دستاویزی ثبوت دینے ہوں گے۔

(ن) تنظیم کوئی مذہبی یا سیاسی تنظیم یا اس قسم کی تنظیموں سے ملحق کوئی تنظیم نہیں ہونی چاہیے۔

(س) تنظیم کو کسی بھی سرکاری محکمے/ایجنسی نے بلیک لسٹ نہ کیا ہو۔ تنظیم یا اس کا عملہ کسی بھی فوجداری یا دیوانی مقدمے بازی میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔

ان اداروں کو حکومت سے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے اس اسکیم میں درج شرائط وضوابط کو پورا کرنا ہوگا۔ اس کی تفصیل وزارت اقلیتی امور کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسکیم کہاں تک کامیاب ہوتی ہے، اقلیتی طبقات کی خواتین اس سے کس حد تک فائدہ اٹھاتی ہیں، ہماری این جی اوز، سماجی کارکنان، خواتین کی انجمنیں، میڈیا، صحافی و قلم کار اس اسکیم کی تشہیر میں کتنا مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ اسکیم کی قبل از وقت تحسین و تنقید کے لیے ابھی مکمل مواد فراہم نہیں ہے لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ اسکیم مسلم خواتین کے لیے اپنے حقوق مانگنے اور ملک کی ترقی و خوشحالی میں برابر کا حصہ حاصل کرنے کے لیے ایک اچھا موقعہ ہے۔

□□□

(خواتین کی اختیار کاری و صنفی مساوات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

آخر کب تک

نعیمہ جعفری پاشا

وہ اتوار کی ایک سست سی کاہل سی صبح تھی۔اتوار کا دن ہفتے کا وہ اکلوتا دن ہوتا ہے جب دہلی جیسے جیٹ کی رفتار سے بھاگتے دوڑتے شہر کی زندگی بھی اپنی رفتار کھودیتی ہے جیسے کسی نے اس برق رفتار گھوڑے پر مہمیز لگا دی ہو۔لوگ اپنے بستروں سے دیر میں نکلتے ہیں، اخبار بھی دیر سے آتا ہے، دودھ والا لڑکا بھی اطمینان سے نو بجے صورت دکھاتا ہے اور گھروں میں کام کرنے والی ملازمائیں بھی سامنے پارک میں بیٹھ کر گپیں ہانکتی رہتی ہیں اور دن چڑھے کام پر آتی ہیں۔لیکن میری نیند تو صبح پانچ بجے ہی کھل جاتی ہے چاہے کوئی دن ہو اور کوئی موسم ہو اور ایک بار آنکھ کھل جائے تو میرے لیے بستر پر پڑے رہنا ناممکن ہوتا ہے اس دن بھی میں اپنے وقت پر اٹھ گئی تھی نماز اور دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور چائے کا مگ اٹھائے بالکنی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن آسمان کے مشرقی کنارے پر نارنجی رنگ کا عکس لہریں لینے لگا تھا۔ماحول میں چڑیوں کی چہچہاہٹ سے زندگی بیدار ہو گئی تھی۔مارچ کے مہینے کی گلابی، خوشگوار اور خوبصورت صبح دھیرے دھیرے اپنے پر کھول رہی تھی۔سامنے کے پارک میں چند بزرگ لوگ چہل قدمی کر رہے تھے۔

آج مجھے وہاں ہمارے پڑوسی منظور صاحب نظر نہیں آئے۔وہ تو بے حد پابندی کے ساتھ اس وقت جاگنگ کرتے نظر آتے تھے۔تب ہی نیچے بلڈنگ کے پاس کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔میں نے چونک کر نیچے دیکھا اس نیلی گاڑی کو میں اچھی طرح پہچانتی تھی۔منظور صاحب کی بیٹی اور داماد بڑی عجلت کے ساتھ نکلے اور تیزی سے زینوں کی طرف بڑھ گئے۔یہ لوگ اتنی صبح کیسے؟؟ میں الجھن میں پڑ گئی۔ذرا ہی دیر میں دوسری گاڑی رکی اور منظور صاحب کی سن رسیدہ بہن چھڑی ٹیک کر باہر نکلیں۔ڈرائیور ان کا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔میرا دل دھڑک گیا۔الٰہی خیر۔کچھ نہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔پتہ نہیں رابعہ کیسی ہے۔میں ہمیشہ رابعہ کی طرف سے فکرمند رہتی ہوں۔ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے جا کر اس کی خیریت معلوم کرنی چاہیے کہ میرے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔میں نے تقریباً دوڑتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔منظور صاحب اور رابعہ کی بیٹی نازو سامنے کھڑی تھی۔آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے اور ناک کی نوک سرخ ہو رہی تھی۔چھوٹتے ہی میرے گلے سے لپٹ گئی۔

’آنٹی۔پاپا نہیں رہے‘

’ارے! کیسے؟ کب؟‘ میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

’صبح چار بجے ممی کا فون آیا تھا کہ ساڑھے تین بجے انھوں نے ممی کے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ان کے سینے میں درد ہو رہا تھا۔ممی نے انھیں ان کے بستر پر لٹایا، پانی پلایا اور ان کی دوا تلاش کر رہی تھیں کہ انھیں ایک ہچکی آئی اور وہ ختم ہو گئے۔‘

اس کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔میں سناٹے میں آ گئی۔

میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا ’تمھاری ممی کہاں ہیں؟‘

’ان ہی کی تو فکر ہے۔انھوں نے اپنے آپ کو اپنے بیڈروم میں بند کر لیا ہے نہ دروازہ کھولتی ہیں اور نہ جواب دیتی ہیں۔‘

’تمھارے لیے دروازہ کس نے کھولا‘۔میں نے بے چینی سے پوچھا۔

’دروازہ کھلا ہی تھا آنٹی۔پھپھی اماں بھی آ گئی ہیں۔انھیں بھی ممی نے ہی اطلاع دی تھی۔لیکن اب ان کی آواز پر بھی دروازہ نہیں کھول رہیں۔پھپھی اماں کی حالت تو یونہی بہت خراب ہے۔پلیز آنٹی آپ آ جائیں کہیں ممی کچھ کر نہ بیٹھیں‘۔

میں نے اسے تسلی دی۔’تم چلو میں دو منٹ میں آتی ہوں۔‘ میں ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھی۔میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، اپنے شوہر ناصر کو جگایا اور موبائل اٹھا کر نمبر ملایا۔دو مرتبہ گھنٹی بج بج کر خاموش ہو گئی۔تیسری مرتبہ اس نے فون اٹھا لیا۔

'نکہت فکر نہ کرو۔ میں خودکشی نہیں کروں گا۔ بس تھوڑی دیر تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ تم نازو سمجھا دو۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں۔'

مجھے یک گونہ اطمینان ہوگیا۔ میں فوراً ہی ان کے گھر پہنچ گئی۔ میرے دروازے کے سامنے ہی ان کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ باجی کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کی آنکھ سے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ میت کی پٹی سے سر ٹکائے 'ہائے منظور ہائے' کا ورد کر رہی تھیں۔ آخر تو وہ ان کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے جنھیں انھوں نے ماں کی موت کے بعد اپنی اولاد کی طرف پالا تھا۔ دروازے پر نازو حیران پریشان کھڑی تھی۔ اس کا شوہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ میں نے نازو کو ایک طرف لیجا کر سمجھایا 'پریشان نہ ہو۔ تمھاری مما ٹھیک ہیں۔ میری ان سے فون پر بات ہوگئی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تنہا رہنا چاہتی ہیں۔ تم اپنے رشتہ داروں اور پاپا کے دوستوں کو اطلاع کر دو' اس کے چہرے پر اطمینان کی لہری دوڑ گئی اور وہ فون لے کر ایک کونے میں چلی گئی۔ اتنی دیر میں ناصر بھی وہاں آگئے تھے اور نازو کے شوہر کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے باجی کو وہاں سے اٹھایا۔ پانی پلایا اور تسلی دینے لگی۔ تھوڑی دیر میں گھر لوگوں سے بھرنے لگا۔ ہر آنے والا رابعہ کے بارے میں پوچھتا اور اس کے اس طرح کمرے میں بند ہو جانے پر طرح طرح کے خدشات کا اظہار کرتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ناصر نازو کے شوہر طاہر کے ساتھ آخری رسومات کے لیے جا چکے تھے۔ منظور صاحب کے سبھی رشتہ دار، دوست اور کولیگ میرے لیے اجنبی تھے انھوں نے باجی اور نازو کو گھیر رکھا تھا اور وہ بھی ان کے درمیان پرسکون محسوس کر رہی تھیں تو میں کچھ دیر کے لیے اپنے گھر چلی آئی۔ نوکرانی اپنے کام میں مصروف تھی اور میں آنکھیں بند کر کے ماضی کے اوراق پلٹنے لگی۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وسنت کنج کی یہ سوسائٹی بھی نئی ہی بسی تھی۔ ڈی ڈی اے فلیٹ کی قرعہ اندازی میں فلیٹ ہمیں ملا تھا۔ ابھی کالونی پوری طرح آبادی بھی نہیں ہوئی تھی لیکن ہم فوراً ہی کرائے کا مکان چھوڑ کر یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ ہمارے سامنے کا فلیٹ جن کے نام نکلا تھا انھیں ہم نے شاذ و نادر ہی دیکھا تھا۔ زیادہ تر فلیٹ میں تالا لگا رہتا۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ پڑوس میں کوئی اچھا سا خاندان آئے تا کہ میری تنہائی رفع ہو سکے۔ پھر ایک دن ایک عمر رسیدہ اور باوقاری خاتون نظر آئیں۔ انھوں نے گھر کی صفائی کروائی۔ سامان کا ٹرک آیا اور مکان فرنش ہونے لگا۔ میں ان کے لیے چائے اور لوازمات ٹرے میں سجا کر لے گئی۔ بہت پیار سے ملیں۔ یہ باجی تھیں انھوں نے بتایا یہ ان کے چھوٹے بھائی کا فلیٹ ہے جو کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائض تھے۔ تنہا تھے اس لیے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ہی رہتے تھے۔ والدین کا سایہ برسوں پہلے سر سے اٹھ گیا تھا۔ باجی نے ہی انھیں اولاد کی طرح پالا تھا۔ اب اگلے ہفتے ان کی شادی تھی اسی لیے فلیٹ نئی دلہن کے لیے تیار کروا رہی تھیں۔ اگلے ہفتے منظور صاحب کی بہن جنھیں میں باجی کہنے لگی تھی۔ چار پانچ لڑکیوں کے ساتھ بغیر کسی تام جھام کے نئی دلہن کو لے کر آ گئیں۔ رات کی اولین ساعتوں میں سب لوگ رخصت ہو گئے۔ لیکن منظور صاحب کہیں نظر نہیں آئے۔ اگلے دن دوپہر کو میں ان کے گھر جا پہنچی۔ وہ 24-23 سال کی ایک دلکش سی اداس آنکھوں والی لڑکی تھی۔ سلک کا گلابی سوٹ پہن رکھا تھا لیکن نئی دلہن والی کوئی بات نہیں تھی۔ بہت خاموش سی تھی۔ بات چیت کے دوران صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ یوپی کے ایک چھوٹے شہر کی رہنے والی تھی۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا ماں اور دو چھوٹی بہنیں کل ملا کر اس کا میکہ تھا۔ منظور صاحب کی بہن نے یہ شادی کروائی تھی۔

دھیرے دھیرے ہماری دوستی ہو گئی۔ اب وہ بے تکلفی سے مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ تب مجھے اس کی آنکھوں کی اداسی کی وجہ معلوم ہوئی۔ کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی منظور صاحب نے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی رشتہ قائم نہیں کیا تھا۔ انھوں نے شادی کی پہلی رات ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلو سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ان کے درمیان مذہب کی دیوار تھی اور باجی، جن کا ہر حکم ماننا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، اس رشتے کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھیں۔ ان کے اور کرن کے درمیان Live in relationship بہت مضبوط تھی۔ وہ اسی کے ساتھ رہتے تھے باجی کے زور دینے پر انھیں شادی کرنی پڑی۔ انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ 'یہ گھر تمھارا ہے۔ اس کی چیز تمھاری ہے۔ تمھاری ہر ضرورت پوری کی جائے گی۔ لوگ باتیں نہ بنائیں اس لیے میں رات کہیں گزارا کروں گا۔ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ رکھنا' اب وہ دیر رات کو گھر آ جاتے ہیں۔ ان کا بیڈروم الگ۔ صبح آفس چلے جاتے ہیں۔

میں سب سن کر اندر سے کھولتی رہی۔ میں نے کہا 'چھوڑو اس منحوس کو۔ پڑھی لکھی ہو اپنی امی کے گھر جا کر رہو۔'

اس نے بے چارگی سے کہا والد کے انتقال کے بعد چچاؤں نے گھر اور کاروبار پر قبضہ جما لیا۔ رحم کر کے دو کمروں کا ایک پرانا مکان ہمیں دے دیا۔ میری ماں بے پڑھی لکھی ہیں۔ انھوں نے محنت مزدوری کر کے ہم تینوں بہنوں کو پالا پڑھایا لکھایا میں نے سوچا تھا کہ میں نوکری کر کے امی کا سہارا بنوں گی کہ غیر متوقع طور پر منظور کا رشتہ آ گیا۔ اچھا گھر اچھا لڑکا۔ جہیز کے نام پر ایک بھی پیسہ لینے کے بجائے باجی نے دو لاکھ کا چیک دیا کہ بارات کی

خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہے۔ امی پھولی نہیں سماتی تھیں کہ ایک لڑکی تو نبٹ گئی۔ رخصت کے وقت انھوں نے کہا تھا ’جیسے بھی ہو وہیں نباہ کرنا۔ میرے سر ابھی دو بوجھ باقی ہیں۔‘ بتاؤ نکہت میں ان سے کیا کہتی اور کیسے جاتی۔ دنیا کی نظر میں میں بہت خوش قسمت ہوں۔ لوگ الٹا مجھے ہی الزام دیتے اور میری بہنوں کے لیے اور پریشانیاں کھڑی ہو جاتیں۔

عورت ذات کی اس مجبوری پر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں دل سے اس کی ہمت اور حوصلے کی قائل ہو گئی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا ’نکہت میرے ساتھ چلو۔ مجھے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔‘ میں نے حیرت سے کہا ’ابھی تو تمھارے پاس شادی کے ہی بہت کپڑے ہوں گے۔‘

اس نے مجھے اپنی الماری کھول کر دکھائی جو لال اور گلابی رنگ کے مختلف شیڈز سے بھری پڑی تھی۔ ’گلابی میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ لیکن منظور کہتے ہیں کہ انھیں اس رنگ سے نفرت ہے۔ گلابی رنگ میں نہ پہنا کروں۔‘

میں جل ہی تو گئی۔ ’جب کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو یہ پابندی کیوں‘ لیکن وہ نہیں مانی۔ منظور کی طرف سے اس پر اور کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بینک میں نوکری کر لی۔ دن تو گزر جاتا لیکن راتیں کروٹیں بدلتے ہوئے کٹتی۔ عمر کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں لمبی کالی راتوں میں اس کا وجود کسی کی باہوں کے لیے ترستا۔ یہ احساس اور ڈس جاتا کہ اس کا شوہر برابر والے کمرے میں پوری طرح مطمئن خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے اور وہ سہاگن ہو کر بھی بیوہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ منظور دیر رات کو نشے میں چور آتے اور کمرہ بند کر کے سو جاتے۔ اس کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے۔

وہ جون کی ایک عام صبح تھی، تپتی اور قہر برساتی۔ صبح ہی سے سورج کی قہر سامانی قیامت ڈھا رہی تھی۔ چرند و پرند اور انسان ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ پیاسی دھرتی پانی کی ایک بوند کو ترس رہی تھی۔ مہینے کا چوتھا سنیچر ہونے کی وجہ سے بینک کی چھٹی تھی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد رابعہ نے اپنے کمرے سے قدم بھی باہر نہیں نکالا تھا۔ سوچا تھا کہ آج کا دن وہ اپنی پسند کی کوئی کتاب پڑھ کر گزارے گی لیکن کتاب کھول کر وہ خیالات میں ایسی الجھی کہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکی۔ ساری دوپہر اپنی زندگی کے اوراق پلٹتی رہی۔ خود احتسابی میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ شام چھ بجے جب کمرے سے باہر نکل کر بالکونی میں جھانکا تو پتہ چلا کہ اس عام سی صبح کی شام تو بہت خاص بن گئی ہے۔ آسمان کالے بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور جھلسا دینے والی لو کے تھپیڑوں کی جگہ ٹھنڈی ہوا کے مست جھونکوں نے لے لی تھی۔ وہ بالکونی میں نکل آئی۔ موسم کی اس اچانک تبدیلی نے اس کے موڈ کو خود بخود ہی بحال کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور تیز بارش میں بدل گئیں۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بالکونی میں بارش کی تیز پھواریں آ رہی تھیں۔ رابعہ سرتاپا بھیگ گئی۔ بچپن سے ہی اسے بارش میں بھیگنا اچھا لگتا تھا۔ ادھر بوندیں گرنی شروع ہوئیں اور ادھر وہ اپنے گھر کے کچے آنگن میں اتری۔ امی لاکھ چلاتیں ’ارے جنم جلی بیمار پڑ جائے گی۔ اندر آ جا۔ دوا دارو کا خرچہ بڑھائے گی کیا؟‘ لیکن رابعہ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ تو مہاوٹوں میں بھی بھیگ لیتی تھی اور سخت جان اتنی تھی کبھی بیمار بھی نہیں پڑی۔ لیکن شادی شدہ زندگی کے گزشتہ چار سال ایسی قحط سالی میں گزرے کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا کہ من کا پاگل پنچھی گنگنا اٹھا۔ وہ جی بھر کر بھیگی یہاں تک کہ بارش کا زور کم ہو گیا اور بالکونی میں آنے والی پھوار رک گئی۔ غسل کر کے اس نے اپنی پسند کا گلابی لباس زیب تن کیا، کلائیوں میں ہرے رنگ کی چوڑیاں پہنیں اور لمبے گھنے بالوں کو سوکھنے کے لیے پشت پر کھلا چھوڑ دیا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا گرم کیا، چائے بنائی اور ڈائننگ روم کی طرف آتے ہوئے دیوار پر لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بنا میک اپ کے چہرے پر بھی کیسا روپ تھا۔ یہ سب کس کے لیے؟؟؟ منظور تو کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں! پھر یہ بجنا سنورنا کیا معنی؟ ’اپنے لیے‘ اس کے دل سے آواز آئی۔ ’کیا میں خود اپنے لیے نہیں سنور سکتی؟ کیا میرا اپنا کوئی وجود نہیں ہے؟ کیا 26 سال کی عمر میں میرے سارے ارمان مر چکے ہیں۔‘

’نہیں‘ آئینے سے آواز آئی۔ میں ابھی زندہ ہوں اور ہر ذی روح کو اپنی خواہشات پوری کرنے کا حق ہے۔‘

انھیں خیالات سے جوجھتے ہوئے نہ جانے کب کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب ہڑبڑا کر آنکھ کھلی۔ کوئی لگاتار دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ ’منظور کے پاس تو دروازے کی دوسری چابی رہتی تھی پھر یہ ڈور بیل کیوں‘ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ سامنے منظور نشے میں دھت کھڑے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انھیں سنبھال رکھا تھا۔ اس نے انھیں بازوؤں کا سہارا دے کر ان کے بیڈروم میں پہنچایا، ان کے جوتے اور موزے اتارے اور چادر اوڑھا کر لوٹ رہی تھی کہ منظور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ کسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے سینے پر جا پڑی وہ پہلی اور آخری رات تھی جو اس نے منظور کے بیڈروم میں گزاری۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ انگ انگ ایک عجیب سے سرور سے سرشار تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور من گنگنا رہا تھا، آخر پتھر پگھل گیا منظور

اٹھ چکے تھے اور شاید واش روم میں تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی، بال سمیٹے، ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑے بستر سے سمیٹے اور جلدی سے باورچی خانے میں گھس گئی کہ کہیں وہ بغیر ناشتہ کیے دفتر نہ چلے جائیں۔ ناشتے کی ٹرے لے کر جب وہ ڈائنگ روم میں پہنچی تو وہ ہاتھ میں اخبار لیے بیٹھے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔

'آئی ایم سوری۔ رات جو کچھ ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نشے میں تھا۔'

وہ ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی۔ انھوں نے صرف چائے لی اور دروازے سے نکلتے ہوئے مڑ کر بولے 'میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں یہ گلابی رنگ اور سبز چوڑیاں نہ پہنا کریں۔ نفرت ہے مجھے ان سے۔'

اس دن میرے گھر آ کر رابعہ مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔

پھر دو ماہ بعد پتہ چلا کہ اس رات کی منظور کی غلطی کی نشانی اس کے اندر پنپنے لگی ہے تو اس نے اس امید پر منظور کو یہ خوش خبر سنائی کہ شاید اب برف پگھل جائے۔ لیکن اس کے برعکس منظور گھبرا گئے اور بولے۔ 'مجھے افسوس ہے میری ایک رات کی غلطی کی آپ کو سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اس مصیبت سے نجات حاصل کرلیں۔ جو خرچ ہو، میں دینے کو تیار ہوں۔ جہاں دستخط کرنے ہوں، میں کردوں گا۔'

اس دن پہلی بار رابعہ پھٹ پڑی۔ 'آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا۔ یہ کوئی ناجائز بچہ نہیں ہے۔ یہ میری چار سالہ شادی شدہ زندگی کا سب سے خوشگوار واقعہ ہے۔ میں اسے جنم دوں گی۔'

منظور نے غیر جذباتی سپاٹ لہجے میں کہا 'آپ کی مرضی لیکن اس بچے کی پیدائش اور پرورش میں آپ کو مجھ سے کوئی تعاون نہیں ملے گا سوائے مالی امداد کے۔'

'مجھے آپ کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ یہ میرا بچہ ہوگا اور اس کی ساری ذمہ داریاں میں اٹھاؤں گی۔'

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہاں جب کسی رات کو منظور زیادہ نشے میں واپس آتے تو دروازے میں چابی گھومتی، گلابی آنچل لہراتا، سبز چوڑیاں کھنکتیں اور منظور کو اندر ڈھکیل دیا جاتا۔ البتہ باجی نے سنا تو نہال ہوگئیں۔ ہفتے میں دو بار آتیں، صدقے واری جاتیں اور دوا و غذا کی تاکید کرتیں اور خوش رہنے کی تلقین کرتیں۔

رابعہ نے ایک خوبصورت سی تندرست بچی کو جنم دیا جو ہو بہو باپ کی شکل تھی۔ منظور اسے دیکھنے اسپتال بھی نہیں آئے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ سرکاری کام سے باہر چلے جاتے تھے۔

رابعہ کی بیٹی نازو میرے بچوں کے ساتھ بڑی ہوئی۔ ایک سنگل پیرنٹ کی طرح رابعہ نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داریاں نبھائیں۔ منظور باجی کے اصرار پر صرف بچی کے اسکول میں داخلے کے وقت ساتھ گئے اور اس کے بعد ننھی نازو کو ہر PTM پر پاپا کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ کبھی نہیں آئے۔

وقت دن اور رات کے پنکھ لگا کر اڑتا رہا ہے۔ نازو نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس کی شادی کا وقت آ گیا۔ منظور نے رابعہ کی درخواست اور دنیا والوں کا واسطہ دے کر صرف اتنا احسان کیا کہ نکاح اور ولیمے میں اپنی حاضری درج کرادی۔ تحفے کے طور پر جب دس لاکھ کا چیک بیٹی کو دیا تو نازو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر واپس ان کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

'پاپا لوٹا سکتے ہیں تو مجھے میرے بچپن کے وہ پل لوٹا دیجیے جب ہر گھڑی، ہر پل، برتھ ڈے پر، گھر پر، اسکول میں PTM پر میں نے آپ کو تلاشا لیکن آپ کبھی کہیں نہیں ملے۔ میرا بچپن باپ کی شفقت کے بغیر محرومی کے شدید احساس کے ساتھ پروان چڑھا۔'

منظور کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک تاریک سا سایہ لہرایا اور وہ سر جھکا کر ہال سے نکل گئے۔

ناصر دروازہ کھول کر اندر آئے تو میں خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی۔ ناصر کہہ رہے تھے۔

'تم ابھی تک یہیں ہو۔ سب انتظام ہو گیا ہے۔ میت کو غسل دیا جا رہا ہے۔ مجھے جلدی سے ایک پیالی چائے دے دو۔ پھر قبرستان جانا ہے' میں نے انھیں چائے بنا کردی۔ ملازمہ کام نبٹا چکی تھی، اسے رخصت کیا اور ناصر کے ساتھ ہی رابعہ کے گھر آ گئی۔ باہر تک لوگ کھڑے تھے۔ میت آخری سفر کے لیے تیار تھی رابعہ نے اب تک دروازہ نہیں کھولا تھا سب ہی کوششیں کر کے ہار چکے تھے اور یہ سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ کہیں ایک اور میت نہ اٹھانی پڑے دروازہ توڑنے کی بھی بات ہو رہی تھی۔ نازو نے اس کے بیڈ روم کا دروازہ آخری مرتبہ کھٹکھٹایا اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا 'مما پاپا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب تو دروازہ کھول دیجیے۔'

چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ دھیرے دھیرے دروازے کے پٹ کھلے۔ دروازے کے بیچوں بیچ رابعہ کھڑی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی، ہاتھوں میں سبز چوڑیاں تھیں، بال کھلے ہوئے تھے اور کاجل لگی سرخ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز تھے۔

Dr. Naima Jafri Pasha

17, Pocket-2 Jasola

New Delhi-110025

ذاکرہ شبنم

پیاسی ممتا

رات بھر کافی زوروں کی بارش ہوئی تھی، اس وجہ سے صبح بھی موسم کافی ٹھنڈا سا تھا، ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں، صبح کے سات بجے تھے، دودھ والے نے جب دروازہ پر دستک دی تو میری آنکھیں کھلیں، میں نے جیسے ہی دودھ لینے کی غرض سے دروازہ کھولا تو باہر ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہوئی کوئی عمر رسیدہ عورت کو اپنی دہلیز پر بیٹھے دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ وہ کافی بھیگی ہوئی تھی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ساری رات وہ بارش میں بھیگتے اور ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے گذاری ہوگی اور ہو سکتا ہے رات بھر ہماری ہی دہلیز پر ہوں، ان کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سی کوفت ہونے لگی اور وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں، شاید اس خوف سے کہ میں انہیں اپنی دہلیز پر بیٹھے دیکھ کر ناراض نہ ہو جاؤں۔ مجھے نہ جانے کیوں ان سے ایک ہمدردی سی ہونے لگی۔ ایک تو عمر رسیدہ عورت، اس پر رات بھر بارش میں بھیگتی رہیں، وہ ہمارے دروازے پر دستک بھی تو دے سکتی تھیں، میں یہی سوچتے ہوئے کھڑی رہی، وہ شاید جانے کے لیے مڑیں، میں نے جلدی سے انہیں آواز دی، سنئے..... کیا آپ رات بھر اس تیز بارش میں یہیں پر بیٹھی رہیں۔ انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ان کی خاموشی اور جھجک سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بیچاری دکھیاری اور بے سہارا ہیں۔ میں نے انہیں رکنے کے لیے کہا اور اندر آکر بیگم کو ساری بات بتائی اور کہا کہ جاکر انہیں اندر بلاؤ اور کچھ کپڑے وغیرہ دو، کوئی حالات کی ماری بے سہارا لگتی ہیں۔ بیگم انہیں اندر لے آئیں وہ کافی جھجک رہی تھیں، ان کی آنکھوں میں ایک مایوسی اور انجانہ سا خوف نظر آرہا تھا۔ کپڑے لینے سے بھی وہ صاف منع کر رہی تھیں، پھر ہم میاں بیوی کے بے حد اصرار پر کہ رات بھر بھیگنے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ انہوں نے مشکل سے کپڑے بدلے اور ہماری ضد پر ناشتہ کیا پھر میری بیگم ان سے پوچھنے لگیں، آپ تو کسی اچھے گھر کی لگتی ہیں، پھر یوں رات کے اندھیرے اور تیز بارش میں تن تنہا کہاں سے آئیں تھیں؟ کیا اس شہر میں آپ کا کوئی نہیں ہے۔ آپ نے ہمارے دروازے پر دستک دے کر ہم سے مدد کیوں نہیں مانگی؟..........

ان سوالات سے ان کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں جیسے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو...... وہ کہنے لگیں، بیٹی کچھ عرصہ پہلے تک میرا سب کچھ تھا۔ اس شہر میں میرا اپنا گھر بیٹا بہو ایک خوشحال زندگی تھی مگر آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے میں بالکل تہی داماں ہوں.......... ہمیں ایک ہی اولاد ہونے کی وجہ سے ہم نے بڑے نازوں سے اس کی پرورش کی اُسے پڑھا لکھا کر ایک قابل انسان بنایا، پھر ہم میاں بیوی اپنے لاڈلے کے لیے ایک چاندی بہو لے آئے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، ایک دن موت نے ہمارے دروازے پر دستک دی اور میرے شوہر کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا...... گھر کے بڑے سرپرست کا سایہ جیسے اُٹھا سب کچھ تبدیل ہوتا گیا۔ نہ وہ اپنا پن رہا نہ وہ پیار اور نہ ہی رشتوں میں وہ شدت، سب کچھ ختم ہو گیا میں خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی اپنے ہی گھر میں مجھے اجنبی ہونے کا احساس ہونے لگا۔ مجھے لگتا کہ میں اپنی ہی اولاد کو ایک بوجھ لگنے لگی ہوں...... پھر ایک دن میرے بیٹے نے یہ فیصلہ سنایا کہ وہ اس گھر کو بیچ کر کسی اچھی جگہ اپنا نیا گھر بنوانا چاہتے ہیں، تب تک وہ لوگ بہو کے میکے میں رہیں گے۔ میرے لیے حکم نامہ صادر ہوا کہ میں اپنے گاؤں جاکر اپنے کسی رشتہ دار کے پاس رہ لوں جب گھر کا انتظام ہو جائے گا مجھے بلا لیا جائے گا۔

میں سوچنے لگی اپنے گاؤں جا کر اپنے رشتہ داروں کو کیا بتاؤں گی اور وہاں پر کیسے رہ پاؤں گی ...... وقت اور حالات کی ماری آخر کرتی بھی کیا، مجبوراً کسی طرح دل پر پتھر رکھ کر گاؤں پہنچ گئی اور وہیں پر رہنے لگی، مجھے گاؤں میں رہتے ہوئے پورے چار سال کا عرصہ گذر گیا، میں شرمندہ سی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، ہمیشہ میری آنکھیں اپنے بیٹے کی منتظر رہتی مگر اس درمیان میرے بیٹے نے ایک بار بھی آ کر مجھ سے ملنا تو درکنار میری خیر خبر تک لینے کی کوشش نہیں کی .... لیکن میں ماں تھی، ممتا کی تڑپ اور کسک نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ راتوں کی نیند میری آنکھوں سے چھن چکی تھی، نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آ کر مجھے منتشر کر جاتے ایک مدت سے اپنی اولاد کی کچھ بھی خبر نہ پا کر میں بے چین ہو اُٹھی۔ پتہ نہیں میرا بیٹا کس حال میں ہوگا۔ خدا نہ کرے کسی مصیبت یا پریشانی میں نہ گھر گیا ہو، میں نے ٹھان لی کہ میں خود شہر آ کر دریافت کروں گی اور کل میں اپنے گاؤں سے شہر چلی آئی۔ یہاں آنے کے بعد میرے قدم سیدھا اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے وہاں جا کر دریافت کرنے پر پتہ چلا میرا بیٹا اور بہو کبھی کے اس گھر کو فروخت کر کے نئے گھر میں منتقل ہو چکے ہیں اور بڑی آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ پڑوسیوں سے اپنی اولاد کی آسودہ اور خوشحال زندگی کے بارے میں جان کر میرا چہرہ ضرور کھل گیا مگر سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا، رہی سہی امید بھی ریزہ ریزہ ہو گئی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، میں سوچنے لگی کہ پھر سے گاؤں جاؤں گی تو رشتوں میں کئی سوال اٹھیں گے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہیں سوچوں میں بھٹکتے ہوئے نہ جانے کب رات ہو چلی، زوردار بارش کی وجہ سے مجھے آپ کے گھر کی دہلیز کا سہارا لینا پڑا........... ان کی باتوں کو سن کر میں سوچنے لگا، ماں باپ تو بچوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں اپنے آپ کو لٹا کر ان کا دامن خوشیوں سے بھر دیتے ہیں مگر والدین کو جو امیدیں اپنی اولاد سے وابستہ ہوتی ہیں وقت پڑنے پر اولاد اس پر کھری کیوں نہیں اترتی؟ ان کی امیدوں پر پانی پھیر کر انہیں بے سہارا کیوں کر دیا جاتا ہے، کیا ان کا ضمیر بھی انہیں ملامت نہیں کرتا ہوگا؟ خون کے رشتوں میں اتنا کھوکھلا پن کیوں آ گیا ہے؟ ایک ماں جو اپنی اولاد کو نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھ کر ہر طرح سے اس کا خیال کرتی ہے چاہے کتنی بھی تکلیف سے کیوں نہ گذرنا پڑے وہ اپنے من میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی اولاد کو بوجھ نہیں تصور کرتی، مسکراتے ہوئے ہر درد کا سامنا کرتی ہے، اس ننھی سی جان کو دنیا میں آتے دیکھ کر پھولے نہیں سماتی، اپنا خونِ جگر دے کر اس کی پرورش کرتی ہے، اُسے انگلی پکڑ کر اپنے پیروں پر چلنا سکھاتی ہے، قدم قدم پر اپنی خوشیوں کی قربانی دے کر پال پوس کر اسے کسی قابل بنایا جاتا ہے۔ پھر جب اولاد کی باری آتی ہے تو ماں باپ کے لیے گھر کے ایک کونے میں بھی جگہ کیوں تنگ ہونے لگتی ہے، یہ کیسی اولاد ہے جو ماں باپ کو بوجھ سمجھ کر کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔

میں سوچوں میں ڈوبا ان کی آواز پر جیسے چونک پڑا میں اور میری بیگم دونوں ایک ساتھ بول پڑے، آپ کہاں جائیں گی۔ آپ چاہیں تو ہمارے گھر میں رہ سکتی ہیں۔ وہ کہنے لگیں، آپ نے مجھ سے اتنی ہمدردی کی یہی بہت ہے۔ میری اولاد نے تو مجھے بوجھ سمجھ کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ اب میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی ...... میں نے کہا آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں کوئی کسی پر بوجھ نہیں بنتا ایسا تو کم ظرف سوچتے ہیں، اللہ نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہے تو اپنے بندوں کے لیے جینے کی راہیں بھی وہی ہموار کرتا ہے، آپ ہماری ماں کی طرح ہیں اس دنیا میں ہمارا کوئی بڑا بزرگوار نہیں ہے، آپ ہمارے ساتھ رہیں گی تو ہمیں خوشی ہوگی اور ہم پر ماں کی ممتا کا سایہ بھی بنا رہے گا، ہماری بات مان جائیے، ہمدردی کی دو باتوں سے ہی ان کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے چھلک پڑیں، شاید یہ دل میں چھپے بے انتہا کرب کا بوجھ تھا جو آنسوؤں کا روپ دھارے بہنے لگا، ہمارے اصرار پر وہ انکار نہیں کر سکیں اور ہمیں خوش رہنے کی دعائیں دیتے ہوئے اس دن سے ہمارے ہی گھر کی بن کر رہ گئیں۔ ہماری ماں جی اور ہمارے چھوٹے سے بیٹے شکیل کی دادی ماں، میرا بیٹا شکیل چار سال کا تھا، دو چار دنوں میں ہی وہ انہیں دادی ماں دادی ماں کہتے ہوئے ان سے کافی گھل مل گیا تھا دن ہو یا رات انہیں سے چمٹا رہتا۔ انہیں کے ہاتھوں سے کھانا کھاتا، انہیں کے ساتھ کھیلتا اور انہیں کے پاس سوتا وہ بھی تو اسے بے انتہا پیار کرتیں، اس کا ہر طرح سے خیال رکھتیں ...... وہ جب سے آئی تھیں باوجود منع کرنے کے بیکار ہی نہیں بیٹھتی تھیں۔ گھر کے کاموں میں میری بیگم کی مدد کرتیں اور خاص اپنے ہاتھوں سے اچھے اچھے پکوان بنا کر کھلاتیں .... ان کی بے مقصد چاہت اور شکیل سے ان کا لگاؤ دیکھتے ہوئے مجھے لگتا یہ ماں کا دل تو ممتا کا اتھاہ سمندر ہے جتنا بھی لٹائے ممتا کی شدت کم نہیں ہوتی، ہمارے گھر میں ان کی آمد سے ہمیں ایک انمول سی راحت اور خوشی مل گئی تھی۔ شکیل کا اسکول گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے بیگم دوپہر میں کھانا لے جا کر کھلا دیا کرتیں، ماں جی بھی بیگم کے

ساتھ اسکول چلی جایا کرتیں اور پھر شام میں بھی دونوں مل کر شکیل کو اسکول سے گھر لے آتیں بیگم بھی ماں جی کا ساتھ پا کر بہت خوش تھیں ۔

اس طرح دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے ۔ ماں جی کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تین سال کا عرصہ گذر گیا ، پتہ ہی نہیں چلا ، وہ ہمارے گھر میں مطمئن ضرور تھیں مگر نہ جانے کیوں میں جب بھی انہیں اپنے بیٹے شکیل کو پیار کرتے اسے نہارتے ہوئے دیکھتا تو مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی پیاس نظر آتی ، ایسا لگتا کہ ان کی پیاسی ممتا کو اب بھی کسی کی تلاش اور انتظار ہے ...... بیگم سے اکثر سنا کرتا کہ ماں جی بچوں سے بے حد پیار کرتی ہیں ، شکیل کے اسکول میں اس کے سارے دوستوں سے بہت پیار سے پیش آتی ہیں سب کو باتیں کراتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں ۔ ایک دن بیگم نے مجھ سے کہا کہ شکیل کا ایک دوست ہے سلیم اسے تو دیکھتے ہی ماں جی کا چہرہ دمکنے لگتا ہے اور اسے دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگا کر پیار سے چومنے لگتی ہیں ..... میں ان کی اس شدت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی اور ان سے یہ سوال کر بیٹھی ، ماں جی آپ کو اس بچے سے اتنا لگاؤ کیوں ہے جب بھی اسے دیکھتی ہیں اپنے آپ پر قابو ہی نہیں رکھ پاتیں ، میرے سوال پر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ کہنے لگیں بیٹی میرا بیٹا بھی بچپن میں بالکل ایسا ہی تھا مجھے اس میں اپنے بیٹے کی جھلک دکھائی دیتی ہے مجھے اس کا بچپن یاد آتا ہے ۔ ماں جی کی باتیں بتاتے ہوئے بیگم بھی جذباتی ہوگئیں ، کہنے لگیں ، باوجود اپنی اولاد کی بے رخی کے وہ اسے بھلا نہیں پائیں ، شاید اسی پیاسی ممتا کا نام ماں ہے جس کی روح ہر حال میں اپنی اولاد کے لیے بھٹکتی رہتی ہے ۔

آج سیکنڈ ساٹرڈے ہونے کی وجہ سے میری چھٹی تھی ، میں دیر تک سوتا رہا اور پھر اٹھنے کے بعد ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں گھر میں ہی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہا تھا ۔ بیگم اور ماں جی جلدی سے گھر کا کام نپٹا کر شکیل کو اسکول سے لانے کے لیے چلی گئی ، بس اس کے لوٹنے کا وقت ہوا ہی جا رہا تھا فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا ، دوسری طرف سے بیگم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھیں آپ جلدی سے اسکول کے قریب آجائیے ماں جی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے ۔ میرے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے ۔ پتہ نہیں کیسے میں لمحوں میں وہاں پہنچ گیا ، پہنچتے ہی میں بیگم سے پوچھنے لگا ، یہ سب کیسے ہوا اور تم کہاں تھیں تم اور ماں جی ساتھ ہی تھے نا ..... بیگم پریشانی کے عالم میں روئے جا رہی تھیں اور کہے جا رہی تھی ، ہم ساتھ ہی تھے جیسے ہی شکیل کو لے کر اسکول سے نکلے ہمارے ساتھ ہی شکیل کا دوست سلیم بھی تھا ، سلیم کو اپنے گھر کی راہ لینے کے لیے روڈ کراس کرنا تھا وہ جیسے ہی روڈ کراس کرنے لگا تیزی سے ایک بس چلی آئی ، اس سے پہلے کہ سلیم اس کی زد میں آتا ماں جی اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑیں اور حادثے کا شکار ہوگئیں ۔ میں نے دیکھا ماں جی شدید زخمی ہوگئی تھیں ، کافی خون بھی ان کے جسم سے بہہ رہا تھا لوگوں کی مدد سے ہم انہیں لے کر اسپتال پہنچے ۔ سلیم کو تو بس ہلکی سی ہاتھ اور پیر میں چوٹ آئی تھی ۔ اس کی مرہم پٹی کروا کر میں نے اسے گھر بھیج دیا ، ماں جی نے اپنی جان پر کھیل کر اس بچے کو بچا لیا تھا وہ ابھی بے ہوش پڑی ہوئی تھیں ڈاکٹر اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے ، علاج جاری تھا ، ہم بہت بے چین ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا ، باوجود کوشش کے ڈاکٹر انہیں بچا نہیں پائے ۔ آخری بار چند لمحوں کے لیے وہ ہوش میں ضرور آئی تھیں ، آنکھیں کھول کر بڑی مشکل سے لب ہلائے اور پوچھنے لگیں وہ بچہ تو ٹھیک ہے نا .... ہم نے انہیں تسلی دی کہ اسے کچھ نہیں ہوا بلکہ آپ نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اس معصوم کو بچا لیا ۔ یہ بات سن کر ان کے ہونٹوں پر ایک مشفقانہ سی مسکراہٹ رینگ گئی اور ان کی ممتا بھری آنکھیں میرے شکیل کو تکنے لگیں جیسے اس سے رخصتی کی اجازت مانگ رہی ہوں .... پھر وہ پیاسی متلاشی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ان کھلی پلکوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کرنا پڑا ۔ ماں جی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں ..... اسپتال کے سارے کام انجام پانے کے بعد ہم انہیں گھر لے آئے پھر ان کے آخری سفر کی تیاری ہونے لگی ، سبھی کی آنکھیں اشکبار تھیں ، ماں جی کا جذبۂ ایثار ہر ایک کی زبان پر عیاں تھا ، میرا بیٹا شکیل مجھ سے لپٹ کر بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا ۔ دادی ماں کو آپ کہاں لے جا رہے ہیں اُس معصوم کے سوالوں کا میں کیا جواب دیتا ، اسے روتا چھوڑ ہم ماں جی کے جنازے کو کاندھا دیے منزل مقصود کی طرف نکل پڑے مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد ہم قبرستان پہنچے جنازے کو ایک طرف رکھتے ہوئے ماں جی کو لحد میں اتارنے کی تیاری کرنے لگے ..... مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ، ماں جی کی اس طرح اچانک جدائی سے میں خود کو بہت شکستہ سا محسوس کرنے لگا ، انہوں نے اتنی کم مدت میں ہمارے گھر میں ہی نہیں بلکہ دلوں میں بھی ایک خاص جگہ بنالی تھی ..... نہ جانے کیوں مجھے اس وقت رہ رہ کر ان کے بیٹے کا خیال آ رہا تھا ۔ پھر جیسے ہی جنازے میں سے انہیں اُٹھانے کے لیے ہم آگے بڑھے کوئی جماعت کو چیرتے ہوئے میرے قریب چلا آیا اور کہنے

لگا میں قدیر ہوں سلیم میرا بیٹا ہے۔ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا آتے ہی پتہ چلا کہ آج اسکول کے پاس میرے بچے کا بہت بڑا حادثہ ہوتے ہوتے بچا عین وقت پر آپ کی ماں نے دوڑ کر میری ننھی سی جان کو بچاتے ہوئے خود حادثے کا شکار ہوگئیں اور چل بسیں...... مجھے اس کا بے حد افسوس ہے...... میں ان کے آخری دیدار کے لیے آپ کے گھر پہنچا تو آپ لوگ نکل چکے تھے، مسجد پہنچنے میں بھی مجھے دیر ہوگئی بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچ پایا ہوں مجھے اس عظیم ہستی کا دیدار کرنا ہے جنہوں نے میرے جگر کے ٹکڑے کی حفاظت اپنی جان دے کر کی ہے۔ میرے گھر کے چراغ کو بجھنے سے بچا لیا........... ماں جی کے چہرے سے میں نے کپڑا ہٹایا، قدیر میاں انہیں دیکھتے ہی ششدر سے ہوگئے۔ جیسے ان کی آنکھیں جھپکنا بھول گئی ہوں...... پھر میں ساتھیوں کی مدد سے ماں جی کو لحد میں اتارنے لگا، قدیر میاں کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی ماں، مو حیرت میں ہکا بکا رہ گیا سبھی حیرت سے قدیر میاں کو دیکھنے لگے وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہے تھے، تدفین تو وقت پر کرنی ہی تھی بعد تدفین کے سبھی واپس ہو رہے تھے مگر قدیر میاں وہیں قبر کے پاس بیٹھے آنسو بہا رہے تھے انہیں دیکھ کر مجھے غصہ بھی آرہا تھا کہ اتنی مدت سے یہ انسان اپنی دنیا میں مگن کتنا لاپرواہ رہا۔ اس نے اپنی ماں کی خیر خبر تک لینا ضروری نہیں سمجھا اور ان کی بد نصیبی پر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ کیسا بدقسمت بیٹا ہے جسے اپنی ماں کے جنازے کو کاندھا تک دینا نصیب نہیں ہوا............

مجھ سے رہا نہیں گیا، میں نے اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا، اب آنسو بہانے سے کیا فائدہ، جب انہیں تمہارے سہارے کی ضرورت تھی تب تو تم نے انہیں ٹھکرا دیا تھا۔ ان کی ممتا لمحہ بھر کے لیے بھی تمہیں فراموش نہیں کر پائی، یہ بچی ممتا کی ڈور ہی تھی جو جانے انجانے میں تمہارے بیٹے تک انہیں کھینچ لے گئی وہ ہمیشہ تمہارے بیٹے میں تمہیں دیکھا کرتیں اور آخر جاتے جاتے بھی اپنی ممتا کے آنچل کو پھیلا کر تمہاری اولاد کو زندگی دے گئی اپنی آخری سانس تک تمہارے ہی نام کر گئی...... زندگی میں کبھی تم نے ان کی قدر نہیں کی اب مرنے کے بعد رونے سے کیا فائدہ، اس دنیا میں تم نے انہیں دربدر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اب تو انہیں چین سے سونے دو خدا کے لیے ان کی روح کو بے قرار مت کرو........... پھر میں وہاں سے کبھی نہ مٹنے والی ایک کسک لیے بوجھل قدموں کے ساتھ نکل پڑا۔

□□□

Zakira Shabnam

W/o Riyaz Ahmad

R-S Foot wear Shop-No -192

M-G Market RobertsonpetK-G-F.

Distt. Kolar-Pin-563122 (Karnataka)

فرہنگ آصفیہ سے

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں یا نکالنی رہ گئی ہیں - محاورہ۔ بہت سا کام تو ہو چکا ہے۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ بہت سی مصیبت کاٹ لی تھوڑی سی باقی رہی ہے۔ ہاتھی نکل گیا ہے۔ دم رہ گئی ہے (فقرہ) ساری سوئیاں نکال لیں۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں۔ (عو) یعنی کام کیا اور پھر نہ کیا۔ عورتیں اس کا قصہ یوں مشہور کرتی ہیں کہ کسی سوداگر بچہ کی کسی جادوگرنی سے دوستی تھی سو وہ اسکی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی ایک روز کیا ہوا کہ اس نے اسکی بیوی کے مارنے کو سوداگر بچہ کے گھر میں جادو کی پڑیا پھکوادی۔ قضا عند اللہ وہ پڑیا اس نیک بخت بیوی کے اوپر تو نہ پڑی سوداگر بچہ ہی کے بدن پر جا پڑی اس کا پڑنا تھا کہ تمام تن بدن میں سوئیاں ہی سوئیاں پھک گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے مارے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی بیوی جو صبح کی نماز پڑھ کر اٹھی تو یہ حال دیکھ کر بہت سٹ پٹائی اور اسی دم سے سوئیاں نکالنے بیٹھ گئی ہاتھوں سے سوئیاں نکالنے میں اسکے خاوند کو تکلیف ہونے لگی تو اسنے اپنے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں۔ تیسرے پہر ساری سوئیاں نکال ڈالیں۔ صرف آنکھوں کی سوئیاں رہی تھیں کہ ظہر کا وقت تنگ ہونے لگا۔ یہ اپنی باندی کو خاوند کے پاس بٹھا کر آپ نماز پڑھنے چلی گئی۔ (باندی نے اس موقع کو غنیمت جان کر رہی سہی سوئیاں جھٹ پٹ نکال ڈالیں۔ ان کا نکلنا تھا کہ ایک کانٹا سا نکل گیا۔ سوداگر بچہ کی جان میں جان آگئی۔ الاللہ کر کے اٹھ بیٹھا آنکھ کھولتے ہی باندی کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا اور اس کا احسان سمجھ کر بن داموں غلام بن گیا۔ بیوی کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ اس بے چاری کو تو آنکھوں سے گرا دیا۔ اور اسکی لونڈی کو بیوی بنا لیا۔ وہی مثل ہوئی کہ باندی تھی سو بیوی ہوئی اور بیوی تھی سو باندی ہوئی۔ اس زمانہ سے یہ محاورہ ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کہانی

تخلیق کار

خلیق النساء

وہ ایک مشہور کہانی کار تھا۔ دنیا نے اس کا سب کچھ چھین کر بدلے میں دیے تھے بے شمار تلخ تجربات جس نے اس کے مشاہدے کی تیزی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ وہ اپنے ماحول، سماج، مصنوعی انسانیت سب سے شاکی تھا۔ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ضرور تھا زمین جائیداد کا اکلوتا وارث۔ لیکن باپ کے آنکھ بند ہوتے ہی اس کے حریص اور ظالم چچاؤں نے قانونی داؤ پیچوں اور دولت کے بل پر اسے اور اس کی ماں کو کل ورثے سے محروم کر دیا۔ دونوں ماں بیٹا عرش سے فرش پر آ گئے تھے۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے نہ صرف اس کی پرورش کی بلکہ پڑھایا لکھایا بھی۔ وہ بچپن ہی سے بلا کا ذہین اور حساس تھا۔ تعلیم مکمل کر کے اس نے سرگرمی سے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ملازمت کی تلاش کے دوران اس پر آگہی کے در واہ ہونے شروع ہو گئے۔ سروس حاصل کرنے کے لیے قابلیت، ڈگری، تجربہ کس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہے تو کسی لیڈر، منسٹر یا سیاسی کارکن کی سفارش یا رشوت میں دینے کو کثیر رقم۔ اس نے ہر محکمہ کو آزمایا اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان نااہلوں کو منتخب کر لیا گیا جس کے پاس یہ دونوں چیزیں تھیں۔ وہ جوتے گھس گھس کر قسمت آزمائی کرتا رہا۔ اس دوران اس کی ماں سخت بیمار ہو گئیں۔

اس نے ڈاکٹروں کے کلینک سے لے کر ہاسپٹلوں کے چکر لگائے تب اس پر کھلا کہ غریبوں کا علاج کرنے والے مسیحا اندر سے کتنے بے رحم ہیں جب تک منہ مانگی رقم نہیں ملتی وہ مریضوں کو دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں پرائیوٹ، ڈاکٹروں کی کارکردگی تو دور کی بات رہی جن ہاسپٹلوں میں 'خیراتی' کا بورڈ لگا ہوتا ہے وہاں کا حال بد سے بدتر ہے رشوت ستانی کا بول بالا ہے۔ خیراتی مریض نہیں بلکہ ہاسپٹل کا عملہ ہے اس کی ماں مر گئی۔

زندگی کی پے در پے محرومیاں، وقت کی ٹھوکریں، اپنوں کی ناانصافی، سماج کی بربریت ایک نیک نفس شہری کے سوچوں کے دھارے کو موڑ دیتی ہے۔ وہ سامنے آئی ہر چیز کو ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کر دینا چاہتا ہے انتقامی جذبہ کی کوکھ سے چور، ڈاکو، دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں جو اپنے سے ہوئی ناانصافیوں کا بدلہ لینے کو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور گیہوں اور گھن کے مقولے کے مطابق معصوم اور بے گناہ شہری بھی نشانہ بن جاتے ہیں۔

وہ سانس لیتا ایک زندہ انسان تھا اور انسان کی سب سے پہلی ضرورت روٹی ہے۔ صبح اٹھتے ہی پیٹ 'ھل من مزید' کا نعرہ بلند کرتا ہے سو دوستوں کے مشورے پر اس نے بینک سے لون لے کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کا سوچا۔ وہ بھاگ دوڑ کرتا رہا تب اسے معلوم ہوا کہ بینکوں کے اندر بیٹھے بڑی بڑی تنخواہوں والے کارکن بھی غریبوں کے لیے دی جانے والی امداد میں حصہ بٹاتے ہیں۔ اسی لیے اس نے Loan Sanction ہونے سے پہلے ہی تمام کاغذات نذر آتش کر دیے۔ وہ اب مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ ناکامیوں کی طویل داستان وہ ہر روز اپنی ڈائری میں رقم کرتا رہا۔ وہ بچپن سے ڈائری لکھتا رہا تھا۔ اس کی زندگی مکمل طور پر ڈائری میں بند تھی۔ تجربوں کے انبار لگ چکے تھے۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ تجربوں کی دوکان کھولے وہ اپنے پر ہوئی زیادتیوں سے عوام کو روشناس کرا سکے۔

تب وہ ایک کہانی کار بن گیا۔ اس کے کردار سماج کے پچھڑے، کچلے، ظلم کی چکی میں پسے لوگ تھے وہ کارل مارکس اور لینن نہیں تھا جو روس کے عظیم انقلاب کا باعث بنتا۔ ہاں وہ موجودہ ڈھانچے کو بدلنا ضرور چاہتا تھا۔ وہ چوری، ڈاکے، دہشت گردی کا حامی قطعی نہیں تھا۔ لیکن سماج کی ان ناانصافیوں سے بھی خوب واقف تھا جن کی بدولت معصوم شہری برائی کے راستے پر چل پڑے ملک میں اس کی کہانیوں کی دھوم مچ گئی جلد ہی وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ مدیروں کے فرمائشی خطوط کا انبار لگ گیا۔ ڈاکوؤں پر لکھی اس کی کہانیاں بہت مقبول ہوئیں۔ ادبی دنیا میں اس کی کہانیوں کی دھوم ضرور تھی لوگ اس کی قابلیت اور انداز تحریر کو سراہتے لیکن اس کو سنکی اور خبط الحواس کے لقب سے بھی یاد کرتے شاید اس کی وجہ اس کا ظاہری حلیہ ہو۔ ملگجا لباس، سر کے بال بڑھے ہوئے، کاندھے پر بیگ اور پرانی کھٹارہ سائیکل۔ آج کی مصنوعی دنیا صرف ظاہر کو دیکھتی ہے۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی وہ اپنی شکستہ کرسی پر بیٹھا سر جھکائے تیزی سے لکھنے میں مشغول تھا کہانی کلائمکس کے قریب تھی۔ ایک مدیر کی فرمائش پر اسے کل ہی یہ کہانی دینا تھی۔ ایک دھماکے کی آواز سے وہ پل بھر کو رکا دوسرے ہی لمحہ اس کا قلم تیزی سے چلنے لگا۔ اسے لگا کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ ایک ہٹا کٹا نوجوان منہ پر ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں انگلش وضع کا پستول تھامے کھڑا تھا۔

دوسرے تخلیق کاروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ جب بھی کوئی کردار تخلیق کرتا اسے لگتا وہ انسانی روپ دھار کر اس کے سامنے کھڑا ہو۔ بازار میں چلتے پھرتے چہرے کولھوں کے بل گھسیٹتے ہوئے بھکاری۔ وزن اٹھا کر چلتے ہوئے ستر سالہ بوڑھی۔ اس وقت وہ ایک ایسے ڈاکو کی کہانی لکھ رہا تھا جو الیکشن کی دھاندلی میں مخالف پارٹی کے غنڈوں کے ہاتھوں ماں کی جان اور بہن کی عصمت لٹ جانے کے بعد اسلحہ لے کر ڈاکہ ڈیپارٹمنٹ میں آ گیا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی سامنے کھڑے ڈاکو کو اپنا تخلیقی کردار سمجھا اور دوبارہ سر جھکا کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اچانک دو بارہ آہٹ ہوئی اس نے دوبارہ نظریں اٹھائیں ایک کی جگہ دو ڈھاٹا باندھے ڈاکو موجود تھے جو اس کے سر کا نشانہ لیے ہوئے تھے۔ اس نے تو ایک ہی ڈاکو تخلیق کیا تھا پھر یہ دو کہاں سے آ گئے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

’جو کچھ نقدی اور زیورات ہیں ہمارے حوالے کر دو‘۔ اوہ تو یہ سچ مچ کے ڈاکو ہیں۔

’جب یہاں تک آ ہی گئے ہو تو آگے بڑھو پورا گھر تمھارے سامنے ہے کہیں کوئی تالا چابی کا جھگڑا نہیں ہے جو پسند آئے لے لو‘۔ ’گھر میں اور کون کون ہے؟‘ ایک نے سوال کیا۔

’کوئی نہیں پورا گھر خالی ہے‘۔ جگدیش جا بکسوں اور الماریوں کی اچھی طرح تلاشی لے تب تک میں اس کو دیکھتا ہوں‘ اس نے ریوالور سے اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بار پھر کاغذ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

’ایک بات سنو‘ کہو‘ ہم جہاں بھی جاتے ہیں...... لوگ دہشت سے ادھ مرے ہو جاتے ہیں تم کیسے انسان ہو جس پر ہماری موجودگی کا رتی بھر اثر نہیں۔ وہ ہنس پڑا۔ دوست جو لوگ تم سے دہشت زدہ ہوتے ہیں وہ تمھیں ڈاکو سمجھتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم بھی میرے جیسے ایک انسان ہو۔ اور پھر موت کا ایک وقت متعین ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھوں میں حیرت کے سائے تھے۔

’یہ تم لکھ کیا رہے ہو‘۔ دوسرا سوال آیا۔

’میں کہانی لکھ رہا ہوں‘ کہانی کیسی کہانی! جو فلم میں ہوتی ہے‘۔

نہیں یار اگر میں فلمی کہانی کار ہوتا تو آج تمھیں میرے گھر سے مایوس جانا نہیں پڑتا۔

’پھر تو تم پریوں دیوؤں اور جناتوں کی کہانی لکھتے ہو گے‘

’میں اپنے جیسے اور تمھارے جیسے انسانوں کی کہانیاں لکھتا ہوں‘

’ہیں، ہم جیسے! کیا ڈاکوؤں کی کہانیاں لکھتے ہو۔ میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی جس کو گھر کی تلاشی پر معمور کیا گیا تھا منہ لٹکائے آ گیا۔ استاد بکسوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔‘ آج سالا نصیب ہی خراب ہے ایک بھکاری کے گھر آ گئے‘ اس نے مزید کہا۔

’یہ ہم جیسے لوگوں کی کہانیاں لکھتا ہے‘۔ پہلے نے ہاتھ اٹھا کر دوسرے کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔ یہی نہیں اس نے پستول کو بھی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

’اس وقت رات کے تین بجے بھی تم ہماری کہانی لکھ رہے ہو۔‘ اس نے دریافت کیا۔

’استاد کیوں ٹائم خراب کر رہے ہو صبح ہونے میں دیر ہے چلو اگلا گھر دیکھتے ہیں‘۔ دوسرے نے کہا۔

’جگدیش بیٹھ جا ڈاکہ تو ہم روز ہی ڈالتے ہیں پر ایسا بندہ آج تک نہیں ملا۔ میں اس کی کہانی سن کر ہی جاؤں گا‘ بے دلی سے دوسرا بھی بیٹھ گیا۔

’ہاں دوست تم نے جواب نہیں دیا۔

’ہاں یہ بھی ایک ڈاکو ہی کی کہانی ہے‘۔ ’پڑھ کر سناؤ‘۔

’یہ ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے پھر بھی اس کے کچھ حصے سنائے دیتا ہوں‘۔

’وہ دو ہی بھائی بہن تھے سلیم اور ثمینہ۔ باپ تو بچپن ہی میں انھیں چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملا تھا۔ ثمینہ کی شادی برابر والے گاؤں میں طے تھی جیسے تیسے انتظام تو ہو چکا تھا پر براتیوں کے کھانے کے لیے بیس ہزار کی ضرورت تھی کیا کرے کیا نہ کرے۔ شادی میں ایک ہفتہ بچا تھا۔ وہ صبح ہی صبح قریب ہی گاؤں میں ایک دولت مند کے پاس ادھار مانگنے چلا گیا۔

الیکشن کا دور تھا۔ ہر طرف شور شرابہ، غنڈہ گردی۔ امیدوار کے جیتنے میں سب سے بڑا حصہ غنڈوں کا ہوتا ہے۔ پبلک کا ناپسندیدہ امیدوار اگر جیتتا ہے تو غنڈوں اور بدمعاشوں کی مہربانی سے۔ بوتھ کیپچر کرنا، دھمکیوں سے ووٹ ڈلوانا یہ سب انھیں کارکنوں کے کام ہوتے ہیں۔ چودھری غنی جس کو گاؤں میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا الیکشن کا امیدوار تھا۔ ہر طرف اس کی گود کے پالے بدمعاش۔

سلیم کو دوست نے بیس ہزار دیے تھے وہ خوشی خوشی گھر لوٹ

رہا تھا کہ جلد سے جلد ماں اور بہن کو خوشخبری سنا سکے۔ ابھی وہ ندی کے پل کے پاس ہی تھا کہ اس نے دس بارہ نوجوانوں کو دیکھا جو کسی بات پر بے تحاشا خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ قریب سے گزرا ہی تھا کہ ایک نے اسے روک لیا باقی بھی نزدیک آ گئے 'کہاں سے آ رہے ہو' پہلے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ 'اگلے ہفتے بہن کی شادی ہے اس سلسلے میں گیا تھا۔' 'اوہ روپیہ کا انتظام کرنے۔ دیکھیں کتنا روپیہ لایا ہے۔' پھر اس کے رونے گڑگڑانے کے باوجود روپے اس کی جیب سے نکل کر چھیننے والے کی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ وہ گرتا پڑتا گھر کی طرف چلا۔ دور تک قہقہوں کی آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی صحن میں پاس پڑوس کی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ لو سلیم آ گیا کسی نے کہا۔

'سلیم تو لٹ گیا برباد ہو گیا رشتے کی چاچی اس کے قریب آئی۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں چاروں طرف دیکھا اور اندر کی طرف قدم بڑھائے اس کی بہن کا لباس تار تار تھا بال بکھرے ہوئے عصمت دری کے بعد اس کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ قریب ہی ماں کی لاش تھی۔ جو بیٹی کی عزت بچانے کی کوشش میں جان ہار بیٹھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پولیس آئی ضروری کارروائی ہوئی چشم دید گواہ نہ ہونے پر کیس دبا دیا گیا حالانکہ سارا گاؤں جانتا تھا کہ یہ کس کے اشارے پر ہوا ہے۔ پھر نیک اور سیدھے سلیم کے اندر کا باغی انسان باہر آ گیا۔ بس دوست یہیں تک لکھا ہے۔

'کوئی اور کہانی سناؤ' اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔

'مشکل ہے'، 'کیوں'۔ 'یہ کہانیاں بہت سے رسالوں میں چھپتی ہیں اور رسالے تلاش کرنا میرے بس سے باہر کی چیز ہے تم ایسی کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟'

دیکھو کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں چوری ڈاکے کو اچھا سمجھتا ہوں ڈکیتی، قتل جرم ہے گناہ ہے۔ برائی ہے۔ مذہب اور قانون دونوں کی نظر میں۔ لیکن میں ایک ڈاکو کے پیچھے اس کا پس منظر ضرور تلاش کرتا ہوں۔ ڈکیتی صرف گن پوائنٹ پر چھینی ہوئی دولت ہی نہیں ہوتی۔ آج ہمارے چاروں طرف بڑے پیمانے پر ڈکیتی ہو رہی ہے۔ سرکاری خزانوں میں کھلے ڈکیتی ہے۔ عوام کے نمائندے بن کر اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جا کر بے تحاشا دولت بٹورنے والے کون ہیں۔ کیا وہ کسی ڈاکو سے کم ہیں۔ محکمہ کی اہم کرسیوں پر ڈاکو براجمان ہیں۔ ملک کے باعزت با اثر لوگ اسمگلنگ اور منشیات فروشی کر رہے ہیں ملک کی پولیس کی بدولت ان کے کاروبار چمک رہے ہیں یہ سب کیا ہے قانون مجرموں کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ کسی بڑی ڈکیتی کی خبر اخبار کے فرنٹ پیج پر ہوتی ہے لیکن کسی اخبار نے ان ڈکیتوں کو بھی پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

وہ دونوں مجھے بڑی عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ صاحب ہم کو آپ کی سب کہانیاں کیسے ملیں گی۔ ان میں سے ایک نے کہا رسالوں میں اخباروں میں۔ اس کا جواب تھا۔ 'تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ سب کو ایک جگہ چھپوالو۔' 'یہ بڑا مشکل کام ہے'

'اس میں کون سی مشکل ہے بازار میں کتابوں والوں کی دوکانوں پر کتابوں کے ڈھیر نظر آتے ہیں'

مشکل، سب سے بڑی مشکل ہے پیسہ۔ میں اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں'۔ 'کوشش کرتے'۔

کوشش، بڑے بڑے ادب نواز سرمایہ داروں کے پاس گیا۔ ایک آدھ لیڈر سے بھی ملا۔ جو آئندہ الیکشن میں انتخاب لڑنے والے ہیں۔ ان زرداروں سے بھی ملا جو میری تخلیق کو قبولیت کی سند عطا کرتے ہیں۔ 'پھر'

'پھر یہ کہ انھوں نے میری تعریف کی اپنا قیمتی وقت مجھ ناچیز کو دیا۔ لوازمات سے چائے پلائی اور عزت کے ساتھ رخصت کر دیا'۔ 'اور کتاب کے لیے پیسہ'

'یار بڑے کڑھ مغز ہو تم ڈاکو کیسے بن گئے'۔ آخر کتاب چھپوانے میں کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ استاد نے کہا' چالیس ہزار'۔ یہ تو کوئی ایسی بڑی رقم نہیں ہے ہم سمجھے لاکھ دو لاکھ کی بات ہوگی۔

وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کچھ دور جا کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا کہ اب موڈ بدل چکا تھا۔

دوست ہمیں پہلی بار کوئی ایسا انسان ملا ہے ہم آپ کی کتاب چھپوائیں گے۔ یہ لیں انھوں نے گڈیاں میز پر رکھ دیں۔ نہیں نہیں میں تم لوگوں کے پیسہ سے کتاب نہیں چھپواؤں گا۔ اس نے نوٹوں کو پرے کرتے ہوئے کہا۔ تم جن زرداروں کے پاس گئے تھے کیا ان کی کمائی حق حلال کی تھی کہہ کر وہ صحن کی جانب کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ بھی ساتھ تھا۔ اس نے پہلے جگدیش سے ہاتھ ملایا۔ پھر استاد کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا دوست نام نہیں بتاؤ گے۔ 'سلیم' کہتے ہوئے دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

❑❑❑

Khaleeq-Un-Nisa
Mazar Tat Shah Mian
Rampur-244901 (U.P)

لالی چودھری

شنل نمبر 5

ہسٹوریکل سوسائٹی کی میٹنگ سے آتے ہوئے اس نے ڈاک میز پر رکھی اور جوتے اتار کر چائے بنانے لگی۔ عام طور پر شام کی چائے پیتے ہوئے وہ اپنی دوست کو فون ضرور کرتی اس لیے کہ وہ چائے کے کپ کے لبریز اور لب سوز ہونے کے علاوہ Tea for two and two for tea کی بھی زبردست قائل تھی۔ اس کے نزدیک شام کی چائے اکیلے پینا ایسے ہی تھا جیسے چاندنی رات میں اکیلے ساحل پہ گھومنا۔

لیکن اس کا شوہر چائے بالکل نہیں پیتا تھا۔ ویسے بھی وہ کام کے سلسلے میں زیادہ تر دوسری ریاستوں یا بیرونِ ملک رہتا اور آفس میں ہوتا بھی تو ڈنر سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ سبھی پاکستانی اس سے دور فاصلوں پر رہتے تھے اور امریکن ہمسایے اور دوست اصلی چائے کے بجائے آئس ٹی پیتے یا کافی۔ اس کے بچوں نے کبھی چائے کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ خود جس فیملی سے آئی تھی وہاں ہر خوشی بھی چائے کے کپ پر منائی جاتی اور ہر دکھ کا علاج بھی چائے کے گرما گرم کپ سے کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بہن بھائیوں کے آپس میں جھگڑوں کا خاتمہ بھی چائے کے کپ سے ہوتا۔ اس کے ابا ظالم اور مظلوم دونوں کو چائے پلاتے۔ ظالم کو اس کے ظلم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے (زہر کو زہر سے مارنے والا نسخہ) اور مظلوم کو اس کے اعصاب کی تسکین اور راحت کے لیے۔

اگر اس کے ابا ڈاکٹر ہوتے تو کسی مریض کو کڑوی کسیلی دوائی نہ کھانی پڑتی۔ ان کے کلینک میں ہر وقت لپٹن اور بروک بانڈ چائے دم ہوتی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ چائے کا کپ کچن کاؤنٹر پر رکھ کر وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔ دونوں بچے اب یونیورسٹی میں تھے اور اکیلے میں گھر کچھ زیادہ ہی کشادہ محسوس ہو رہا تھا یا شاید اس کا اپنا وجود سکڑتا جا رہا تھا۔

کپ اٹھا کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی اور ڈاک دیکھنے لگی۔ ڈسکور، امریکن ایکسپریس، سٹی بینک وہ بنا کھولے اسی طرح ایک ایک لفافہ واپس رکھتی گئی۔ آئی ٹی ہارٹ فورڈ کے بعد اگلا لفافہ بڑے خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں اس کے نام تھا۔

اس نے لفافے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بنا کھولے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ 'لاحول ولا ایسر ڈپنے کی بھی ہوتی ہے' اپنی حماقت پہ مسکراتے ہوئے اس نے لفافہ کھولا۔

'چاندنی!

نہ جی لکھ رہا ہوں نہ جان، نہ محترمہ نہ صاحبہ کہ ہو سکتا ہے کہ پہلے دو القاب تمھیں پسند نہ آئیں اور آخری دو القاب مجھے بالکل پسند نہیں۔ حیران ہوتا کہ میں تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ دیکھا جائے تو لکھنے کے لیے نہ بیتی باتیں ہیں نہ گمشدہ افسانے۔ نہ ہمارے ماضی کا کوئی حصہ مشترک ہے اور نہ کسی یاد میں کوئی ساجھے داری ہے۔ تم تو مجھے جانتی بھی نہیں ہو لیکن میں تمھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں'۔

اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹیک لیا۔ کیسا نائیو ہے جو اتنے وثوق سے کہہ رہا ہے کہ 'میں تمھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں' کون کسی کو اتنی اچھی طرح سے جان سکتا ہے۔ پرت در پرت لوگ ہیں۔ آخری تجربے میں تو یہی انکشاف ہوتا ہے کہ لوگ باہر سے رفاقت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن اندر سے ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہوتے ہیں۔ زندگی کا ماحصل یہی اجنبیت اور تنہائی ہے۔

وہ پھر خط پڑھنے لگی۔

'میں تمھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ پچھلے سال مشاعرہ میں

جب تم فائیواسٹار ہال میں اکیلی داخل ہوئیں تو مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ تم مدافعانہ زندگی گزار رہی ہو۔ مجھے تمہارے شوق، تمہاری پسندیدہ کتابوں، تمہارے من پسند شاعروں اور ادیبوں سب کا پتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہال میں بیٹھی ہوئی اس رات تم کیا سوچ رہی تھیں۔'

DIOS MIA تو کیا یہ شخص بھی دیو مالائی کرداروں میں سے ہے جو کسی خفیہ اور پر اسرار طریقے سے اس کے ذہن میں داخل ہو کر اس کی ساری سوچوں کو، سارے خدشوں کو جان گیا ہے۔

اس نے بے یقینی سے اپنا سر ہلایا۔ چائے کے چند گھونٹ لیے اور آگے پڑھنے لگی۔

'تم سفید کھڑکیوں اور دروازوں والے ہلکے سرمئی رنگ کے ٹرالی لیول گھر میں رہتی ہو جس کے باہر والے لان میں زیتون اور انجیر کے درخت ہیں۔ جب شام کا ڈھلتا ہوا سورج حد نگاہ تک افق پر پیتل اور تانبا بکھیر رہا ہوتا ہے تو تم کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑی دور کہیں کھو جاتی ہو۔ تمہیں شامیں بہت پسند ہیں چاہے وہ سرمئی اور دھندلی ہوں اور چاہے سونا بکھیرتی ہوئی۔ ان میں کبیر کے دوہوں جیسی یاسیت ہوتی ہے اور غالب کے اداس شعروں جیسی چمک۔ انجیر کے پتوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی اور سایے جب تمہارے چہرے پہ کانپنے لگتے ہیں اور کوملیا کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے ہوا کے جھونکے جب تمہیں چونکا دیتے ہیں تو تم کھڑکی سے ہٹ کر واپس فیملی روم میں چلی جاتی ہو اور ٹی وی لگا کر خبریں یا پرانے سٹ کام دیکھنے لگتی ہو۔

تمہاری فیملی کے سارے افراد تمہاری دنیا میں ناخواندہ مہمان ہیں۔ تمہارے خاوند نے کبھی یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہاری مہتابی جھیل جیسی آنکھوں میں کن سوچوں کی پرچھائیاں لڑ رہی ہیں۔ تمہارے بچے سس پسی مڈ پائی بناتے ہوئے اپنے ننھے منھے کیچڑ آلودہ ہاتھوں سے تمہیں چھوتے رہے ہیں لیکن تم پھر بھی بے داغ اور پوتر ہو کہ تمہیں کوئی آلودگی چھو ہی نہیں سکتی۔ تم اس رات اپنی مدافعانہ زندگی کے حصار سے نکل کر ہال میں یوں داخل ہوئیں جیسے دور پہاڑوں کے دامن میں کسی معبد سے آتی ہوئی کوئی دیوی ہو۔ تم سفید رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی جس پہ یہاں وہاں ادھر ادھر نقرئی مقیش کے دانے یوں جگمگا رہے تھے جیسے چاند کے گرد ننھے منے ستارے۔ اور میں نے تمہارے آنچل سے کچھ ستارے چرا کر اپنی مٹھیوں میں بھر لیے۔'

چاندنی کے گال تمازت سے دہکنے لگے۔

'کیا حسین تصور ہے، کیا دل فریب خیال آرائی ہے۔' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ اس فیکس ایج میں بھی کوئی ایسے رومینٹک خط لکھ سکتا ہے اور اس کے وجود میں ایک عجیب سی سرشاری تحلیل ہونے لگی۔

خط میز پر رکھ کر وہ بیڈ روم میں آ گئی اور آئینے میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ گلابی پردوں کا عکس سفید دیواروں پہ منعکس ہو رہا تھا اور وائٹ اوک کے فرنچ پرونشل ڈریسر پر چاندی کی ٹرے میں پرفیومز اور لپ اسٹک پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے شنل نمبر 5 کی بوتل اٹھا کر ذرا سا پرفیوم اپنی کلائی پہ ملا اور پنک فلرٹ شیڈ کی لپ اسٹک لگانے لگی۔ نائٹ سٹینڈ پہ ان کی فیملی پکچرز پڑی تھیں۔ بولسا چیکا ساحل پہ سینڈ کاسل بناتے ہوئے اس کی بیٹی دنیا کی تصویر تھی۔ ٹریفالگر سکوئر میں کبوتروں میں گھرا ہوا اس کا بیٹا دین کھڑا تھا اور ہائیڈ پارک میں بینچ کے پاس کھڑے ہوئے اس کی اور جمیل کی تصویر تھی۔ اور کینا پی بیڈ کے پیچھے دیوار پر اس کی پسندیدہ پینٹنگ 'ویرانے میں بہار' آویزاں تھی۔

گھر دیکھنے میں جتنا خوبصورت تھا اتنا ہی بے کیف اور اداس بھی۔

'جمیل اس دفعہ بھی لندن سے شاید میرے لیے کچھ نہ لائے' اس نے لمبی سانس لے کر سوچا۔ گزشتہ کئی مہینوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔ پچھلی مرتبہ اسے یوں خاموش دیکھ کر جمیل نے کہہ بھی دیا تھا کہ 'ہر چیز یہاں بھی ملتی ہے۔'

اس نے احتجاجاً کہنا چاہا تھا کہ 'بات چیز کی نہیں ہوتی۔ بات اس خیال اور اس تصور کی ہوتی ہے جو چیز خریدنے کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے' مگر سینے میں کوئی کٹار اتنی شدت سے چبھی کہ ہونٹ ساکت ہو گئے (مدافعانہ زندگی گزارنے کی بہتر مثال) اسے رنجیدہ دیکھ کر وہ پشیمان سا ہو گیا تھا۔

'چاندنی تمہیں پتا ہے کہ مجھے اسٹوروں میں خوار ہونے کی عادت نہیں ہے۔'

'اور شاپنگ کی ساری علتیں تو مجھ میں ہیں۔ لکی اور البرٹسن سے لے کر نورڈسٹروم تک خوار ہوتی پھرتی ہوں' وہ اپنی برداشت کھو بیٹھی۔

'تم اور نورڈسٹروم میں خوار ہو؟' جمیل نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'شاپنگ کے علاوہ تمہیں اور کام کیا ہے؟'۔

'تمہیں لگتا ہے کہ میں سارا دن کچھ نہیں کرتی بس شاپنگ ہال میں وقت گزارتی ہوں۔ ہسٹوریکل سوسائٹی کا کام، فرعون صفت مردوں کے ظلم و تشدد کی ماری مظلوم عورتوں کی امداد۔ اتنے کام ہیں'

'تمہیں کون سی تنخواہ ملتی ہے۔ والینٹری کام ہے۔ ایک ادارہ چھوڑ دو' جمیل نے کہا۔

'اگر تم اپنے بزنس ٹرپ کم کر کے گھر میں رہو تو میں تنہائی سے

اکتا کر اتنا والینٹری کام نہ کروں۔ دین اور دنیا چھٹیوں میں گھر آتے ہیں اتنا بڑا گھر اور میں اکیلی۔'

'گھر بیچ کر کانڈو لینے کا ارادہ تو نہیں؟' جمیل نے ہنس کر کہا۔

'ویری کیوٹ' وہ اگلا پچھلا سب حساب چکانے پہ تل گئی۔ 'تم کسی فنکشن میں، میری کسی دوست کے گھر پارٹی میں میرے ساتھ نہیں جاتے مجھے تنہا دیکھ کر لوگ چہ میگوئیاں کرتے تھے اب تو عورتیں برملا ایک دوسری سے کہنے لگ گئی ہیں کہ شکل سے شادی شدہ نہیں لگتی۔'

جمیل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

'واقعی تمہارے چہرہ پہ وہ پژمردگی وہ تھکی ماندی بے رونقی اور فرسٹریشن نہیں ہے جو شوہر والی عورتوں کے چہرے پہ ہوتی ہے۔ صنف مخالف تو تمہیں سنگل دیکھ کر دل تھام کے رہ جاتے ہوں گے' وہ بڑے لائٹ موڈ میں تھا۔

'تنہا رہتے رہتے اب تو مجھے بھی یہی محسوس ہونے لگا ہے کہ تم محض میری ذہنی اختراع ہو۔ حقیقت میں تمہارا کوئی وجود نہیں' اس نے ہیرے کی کنی جیسی کاٹ میں کہا۔

'دین اور دنیا کس کی اختراع ہیں؟ وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

'ہم دونوں کی' چاندنی اپنے آپ کو کوستی ہوئی اسٹڈی روم میں چلی گئی۔ اس کا ہی یہ آدرش تھا کہ کسی انتہائی بے نیاز آدمی سے شادی کروں گی۔ کالج میں لڑکوں کو بھنوروں کی طرح منڈلاتے دیکھ دیکھ کر جان تمنا جیسے انداز تخاطب والے انتہائی تھرڈ کلاس رومانی خط پڑھ پڑھ کر اسے محبت سے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ فرہاد، مجنوں، رانجھا اور مہیوال سب دس نمبریے غنڈے لگنے لگے تھے۔ جمیل کو اس نے اپنی کزن کے ولیمہ پہ دیکھا تھا۔ وہ کوک کا گلاس لیے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ کوئی پیچھے سے بڑی عجلت میں اس سے ٹکرایا اور کوک چھلک کر گرنے سے اس کے انگوری شیفون کے کرتے کا ستیاناس ہو گیا۔

بھیگے کرتے سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا درمیانے قد کا قبول صورت آدمی اپنی جیب سے رومال نکال کر اسے دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

'آپ کے کپڑے خراب کرنے کا مجھے بے حد افسوس ہے'

'کوئی بات نہیں' وہ اس کے رومال سے اپنے آپ کو پونچھتے ہوئے بولی۔ 'یہ کرتا ہی منحوس ہے جب بھی پہنا کسی نے اس پہ کچھ نہ کچھ ضرور گرایا ہے شاید لوگوں کو یہ کرتا پسند نہیں۔'

اس کی جگہ کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا تو اتنا ضرور کہتا 'حسین کرتے بھیگے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں'۔ لیکن وہ صرف یہ کہہ کر کہ:

'مجھے تو اس میں کوئی خرابی نہیں لگتی' اپنا رومال واپس لے کر چلا گیا۔ دو ماہ بعد جب جمیل کے گھر سے اس کی شادی پر پوزل آئی تو اس نے اپنی دیدی سے کہا۔

'دیکھنے میں تو سوبر اور اچھا ہے لیکن ہے بہت ٹھس اور خشک مزاج۔'

'نہ تمہیں وارفتہ مزاج پسند ہیں نہ خشک مزاج، کسٹم میڈ خاوند کہاں سے لائیں'۔ دیدی نے ہنس کر کہا۔

'ویسے جب تم اسے شادی کی نکیل ڈال لو تو آہستہ آہستہ اس کا مزاج بدلتی رہنا۔ اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم اس کے اندر کیا تبدیلی لا رہی ہو۔ شادی کے چھ سات سال بعد تم نے اسے اپنے نظریات اور آئیڈیل میں مولڈ کر لیا ہو گا۔'

'کیا یہ سو فیصد آزمودہ نسخہ ہے دیدی؟'۔

'مائی ڈارلنگ سس (Sis) وہ نسخہ ہے جو بیویاں روز اول سے استعمال کرتی آئی ہیں'۔

دیدی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

اور یوں اس کی شادی جمیل سے ہو گئی۔ دونوں کی پسند و ناپسند ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھیں اس نے جمیل کو اپنے نظریات میں ڈھالنے کے لیے چپکے چپکے ہر کوشش کر دیکھی۔ لیکن وہاں تو ڈھاک کے تین پات والی بات تھی۔ سو تنگ آمد بجنگ آمد کے بجائے وہ اپنی دیدی کی ساری نصیحتوں کے برعکس خود جمیل کے نظریات میں ڈھلتی گئی۔

واپس آ کر وہ پھر خط پڑھنے لگی۔

'تمہیں جانے پہچانے اجنبی لوگوں کے ساتھ رہتے دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار صبحیں یہ گرم گداز دو پہریں، یہ خنک راتیں تمہارے ساتھ ساتھ میرا بھی المیہ بن گئی ہیں۔'

باقی آئندہ

جواد علی

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح شادی شدہ تھا اور اس بھنور میں مدتوں سے اکیلا ڈول رہا تھا اور اب اسے اپنی جانب کھینچ کر اس بھنور سے نکلنا چاہتا تھا جو اسی طرح کی گرداب میں گری ہوئی اس سے الگ لہروں پہ تیر رہی تھی۔

بے خیالی میں وہ کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر یونہی بے

وقت سے دو دن پہلے گھر آ گیا تھا۔

'اتنی جلدی کیسے آ گئے؟' چاندنی نے حیرت سے پوچھا۔

'کام ختم ہو گیا تھا گلومی لنڈن میں رہ کر کیا کرتا' اس نے بیگ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

ایسا بھی خشک آدمی کس کام کا۔ دل رکھنے کو ہی کہہ دیتا۔

'تمھارے بغیر اداس ہو گیا تھا جلدی جلدی کام نپٹایا تا کہ تمھارے زلف و رخسار کی جنت میں آ سکوں' یہ سوچتے ہوئے مدافعانہ زندگی گزارنے والی چاندنی نے پوچھا۔

'وقت اچھا گزرا؟'۔

ھنی میں نے تمھیں کتنی مرتبہ بتایا ہے کہ جب میں بیرونِ ملک بزنس ٹرپ پر جاتا ہوں تو اچھا وقت گزارنے کے لیے نہیں جاتا۔ کام کرنے جاتا ہوں۔ ویسے بھی دھند اور کہر میں لپٹے لندن میں کون انجوائے کر سکتا ہے۔ میرا کام کام کرنا ہے اور تمھارا کام انجوائے کرنا ہے'۔ وہ اپنی ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے بولا۔

چاندنی لنچ کے لیے کولڈ کٹ سینڈ وچ اور سیلڈ بنانے کچن میں آ گئی۔ جمیل نے کچن میں آ کر چھوٹا سا گفٹ بکس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

' ھنی میں اسی کشمکش میں رہتا ہوں کہ تمھارے لیے کیا خریدوں۔ سوئیٹر تم نہیں پہنتی ہو۔ جیولری سے تم فیڈ اپ ہو'۔

چاندنی نے ڈبہ کھول کر ٹشو پیپر ہٹائے تو شنل نمبر 5 پرفیوم دیکھ کر اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

'تمھیں پتا ہے چاندنی میں لفظوں کے معاملوں میں بہت پھسڈی ہوں۔ مجھے صرف نمبر آتے ہیں اور جہاں تک میری دنیا کا تعلق ہے اس میں تم Numero Uno یعنی نمبر ون ہو'۔

یہ کہتے ہوئے وہ سینڈوچ اٹھا کر باہر نکل گیا اور یہ بھی نہ ہو سکا کہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اس کے ہونٹوں پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دیتا۔

لنچ کے بعد وہ اسٹڈی روم میں آ گئی اور خط کو اختتام تک لاتے ہوئے اس نے لکھا:

'لیکن یہ مت سوچنا کہ مجھے اپنے خاوند سے محبت نہیں ہے۔ اگرچہ میری اندرونی زندگی میں اس کا کوئی گزر نہیں لیکن ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ میری بیرونی زندگی کو اتنی نرمی اور یگانگت سے چھوتا ہے کہ میری اندرونی زندگی کے سارے تار اس لمس سے مرتعش ہو کر خوبصورت راگنی میں ڈھل جاتے ہیں۔ خدا حافظ اور گڈ لک۔

چاندنی'

خط میل کرنے کے بعد وہ کئی دنوں تک سوچتی رہی کہ اگر جمیل اس کے لیے شنل نمبر 5 نہ لاتا تو اس کہانی کا انجام کیا ہوتا؟۔

□□□

Lali Chaudhry

California, America

فرہنگ آصفیہ سے

آفتابی۔ ف۔ اسم مؤنث (۱) سورج مکھی۔ ڈھال۔ ایک دائرہ سا بنا ہوا ہوتا ہے جو بادشاہوں کے جلوس میں ماہی مراتب کے ساتھ چلتا ہے اور بادشاہوں کے سر پر اس کا سایہ بھی مثل چھتر پڑتا ہے۔ اور کبھی پان کی شکل پر مثلثی بھی بنائی جاتی ہے۔ (۲) آفتاب پرست۔ شمّاس۔ شمّاسی (۳) ایک قسم کی آتشبازی ہوتی ہے جس میں شورہ۔ گندک۔ اندرائن نمک وغیرہ بھر کر قلمیں سی بنا لیتے ہیں (۴) وہ چھتری جو صرف دھوپ سے بچائے بارش سے پناہ نہ دے (۔صفت) گول۔ مدور۔ گول مول۔ دائرہ۔ چکر۔ جیسے آفتابی چہرہ آفتابی دائرہ۔

زاویہ۔ ع۔ اسم مذکر۔ کونا۔ گوشہ۔ کھونٹ۔ مخالف سمتوں سے دو مستقیم خطوں کے ایک نقطہ پر ملنے سے جو کونہ پیدا ہوا اسے زاویہ کہتے ہیں۔ اقلیدس میں زاویہ کی مشہور قسمیں یہ ہیں زاویہ مسطحہ جو دو مستقیم خطوں کے ایک نقطہ پر ملنے سے پیدا ہو بشرطیکہ وہ دونوں خطوط مل کر ایک مستقیم خط نہ ہو جائیں۔ زاویہ مستقیم الخطین جو سطح مسطوی پر دو خط کے ملنے سے پیدا ہو۔ زاویہ قائمہ۔ وہ جو ایک خط مستقیم پر دوسرا خط مستقیم اس طرح واقع ہونے سے کہ اس خط کے دونوں جانب برابر کے زاویے پیدا ہوں ظہور میں آئے۔ یہ ہر ایک قائمہ کہلائیگا زاویہ منفرجہ یعنی فراخ کونہ جو قائمہ سے بڑا ہو۔ زاویہ حادہ یعنی تنگ کونہ جو قائمہ سے چھوٹا ہو۔

باپ مارے کا بیر۔ ہ۔ محاورہ۔ (۱) قدیمی۔ عداوت (۲) نہایت دشمنی۔ وہ عداوت جو بزرگوں سے چلی آئے۔ خاندانی عداوت۔

چشمہ فاروقی

ایماندار

صبح کے پانچ بجے تھے چاندنی اپنی باہوں میں روشنی سمیٹے چھپنے کے لیے آسمان کی سیر کر رہی تھی۔ تارے بھی آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے پرندوں کی سریلی آواز سن کر بھولا کی آنکھ کھل گئی وہ جھٹ سے اٹھ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور کوئلے سے دانت صاف کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ منھ دھو کر اندر آ گیا تو اس کی بیوی روپی ایک کٹورہ بھر چائے اور ایک گڑ کا چھوٹا سا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی سنو جی گھر میں چینی بالکل نہیں ہے بس گرم پانی میں تھوڑی پتی ابال کر لائی ہوں ایک گھونٹ چائے کے ساتھ گڑ چکھ لینا۔ بھولا نے چائے لیتے ہوئے کہا ہاں بھائی اس کا اتنا بھی دینا بہت ہے یہ گڑ بھی نہ ہوتا تو ہم کیا کرتے اور خوشی خوشی چائے پینے لگا۔

بھولا اور روپی بہت غریب تھے ان کی ایک بیٹی تھی گڑیا بھولا اور روپی اپنی بیٹی گڑیا سے بہت پیار کرتے تھے دونوں ہی اسے پڑھا لکھا کر ایک ٹیچر بنانا چاہتے تھے بھولا روز صبح اٹھ کر ایک کھیت میں کام کرنے جاتا اور روپی گاؤں کے ایک اسکول میں جھاڑو پوچھا کرتی تھی۔ ایک دن صبح پانچ بجے بھولا کھیت میں کام کرنے جا رہا تھا راستے میں اسے ایک چھوٹے بچے کی رونے کی آواز سنائی دی بھولا جلدی سے وہاں پہنچا تو وہاں ایک جوان عورت پیڑ کی شاخ میں پھانسی پر لٹک رہی ہے اور بچہ زمین پر پڑا بلک بلک کر رو رہا ہے وہیں اس بچے کے قریب ایک پرانا بکس بھی پڑا ہوا ہے یہ سب دیکھ کر وہ گھبرا گیا اس نے آس پاس دیکھا تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا کر چپ کرایا اور وہاں پڑے اس بکس اور بچے کو لے کر گاؤں کے سرپنچ کے پاس پہنچ کر ساری بات بتائی۔ ٹھاکر صاحب بچے کو وہاں چھوڑ کر اپنے نوکروں کے ساتھ اس پیڑ کے پاس پہنچے تب تک وہاں لوگوں کی کافی بھیڑ ہو چکی تھی جہاں ایک عورت پھانسی پر لٹک رہی تھی ٹھاکر صاحب نے اس عورت کو پہچاننے کے لیے کہا لیکن کوئی اسے نہیں جانتا تھا ان کے ایک نوکر نے کہا مالک اس کے ہاتھ میں ایک چٹھی تھی بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ سے نکال کر لایا ہوں لٹکے لٹکے ایک دم سخت ہو گئی ہے ٹھاکر صاحب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا۔ جس میں لکھا تھا اس گاؤں کے مکھیا جی نمستے۔

میرے باپو تو بچپن میں ہی چل بسے تھے ماں کے ساتھ کسی طرح میں جی رہی تھی دو سال پہلے وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی میں بہت دکھی ہو گئی بہت اکیلی ہو گئی تھی تبھی میری زندگی میں ایک لڑکا آیا اس نے مجھے بہت پیار دیا اس نے مجھ سے بہت وعدے کیے میں اپنی اندھیری زندگی میں تھوڑی سی روشنی پا کر اس کے پیار میں ڈوبتی چلی گئی اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے بیاہ کر کے اپنے گھر لے جائے گا اس دھوکے باز نے میرے بے سہارا ہونے کا فائدہ اٹھا کر سب کچھ لوٹ لیا اور غائب ہو گیا میں نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ مجھے نہیں ملا پھر میں نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی لیکن ایک اور وجود میرے اندر پرورش پا رہا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ اس کا کیا قصور اس نے کیا بگاڑا ہے بس یہی سوچ کر دوسرے گاؤں چلی گئی جہاں کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔ میں وہاں گونگی بنی رہی گاؤں والوں نے ترس کھا کر مجھے

رہنے دیا بہت مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے اس بچے کی پیدائش ہوئی پھر اپنا بچہ لے کر میں اس گاؤں سے چل دی۔ لیکن جہاں جاتی غلط نظریں میرا پیچھا کرتی مجھ میں اب برداشت کی طاقت نہیں ہے اس لیے یہ معصوم بچہ آپ کے حوالے کر کے اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ آپ کے مزاج کے بارے میں سن رکھا ہے امید ہے آپ ناانصافی نہیں کرو گے آپ بزرگ ہیں اچھے اور برے لوگوں کی پہچان رکھتے ہیں اس بچے کو کسی ایسے انسان کو دے دیجیے جو اسے اپنا سمجھ کر پرورش کر سکے تاکہ میرا بچہ ایک نیک انسان بن کر اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے اس بچے کے ساتھ تھوڑا سامان اور کچھ روپے چھوڑ کر جا رہی ہوں یہ سب بھی اس انسان کو دیجیے جو میرے بچے کو اپنائے گا امید ہے آپ میرا یہ کام کر کے دونوں جہان میں عزت پائیں گے ایک ابھاگن ٹھاکر صاحب نے اس کے خط کو پڑھ کر اپنے آدمیوں کے ذریعہ اس کا انتم سنسکار کرایا اور پورے گاؤں کو بلا کر پنچایت کی سب یہ سوچ رہے تھے کہ کیوں بلائے گئے ہیں تب ٹھاکر صاحب بولے آپ لوگ خاموش ہو جائیں اور میری بات پر غور کریں پھر انھوں نے وہ خط پورے گاؤں والوں کے سامنے سنایا۔ بھائیوں اور بہنوں آپ سب کل کے واقعہ سے واقف ہیں۔ مرنے والا مر گیا ہم اسے غلط الفاظ سے کیوں یاد کریں قسمت نے اس لڑکی کے ساتھ ناانصافی کی ہے بچپن میں باپ مر گیا جب شادی کی منزل آئی تو ماں مر گئی اس نے اپنی زندگی میں روشنی کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی دھوکہ دے کر بھاگ گیا پھر اس بے سہارا نے خودکشی کر لی میں مانتا ہوں کہ اس نے ٹھیک نہیں کیا خیر اب ان باتوں کو کرنے سے کیا فائدہ گاؤں والوں نے اس کاغذ میں لکھی ہر بات سنی ہے اس کی خواہش ہے کہ اس کا معصوم بچہ کسی نیک انسان کے ہاتھ میں دوں آپ بتائیے کہ آپ میں سے کون ہے جو اسے اپنانا چاہتا ہے ٹھاکر صاحب کی باتیں سن کر سب گاؤں والے نہیں نہیں کرنے لگے ایک عورت بولی واہ رے واہ پتہ نہیں کس کا گناہ ہے اسے بے چاری کہہ کر ہمارے گلے کیوں باندھنا چاہتے ہیں ایک عورت بولی وصیت تو ایسے کر کے گئی ہے جیسے کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اگر ٹھاکر صاحب کو اتنا رحم آ رہا ہے تو خود ہی کیوں نہیں رکھ لیتے لگتا ہے بڑھاپا ہونے کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی طاقت کم ہو گئی ہے کسی اناتھ آشرم میں جمع کیوں نہیں کرا دیتے۔ ایسی ہی بھلی تھی تو بچے کو چھوڑ کر مر کیوں گئی جتنے منہ اتنی باتیں مگر بچہ لینے کو کوئی راضی نہیں۔ کافی دیر کے انتظار کے بعد ٹھاکر صاحب نے کہا کہ آپ میں سے کوئی بھی اس بچے کو لینے کو راضی نہیں ہے پھر ٹھاکر صاحب نے ایک کو بلایا ارے تیری شادی کو 15 برس گزر گئے اور کوئی اولاد نہیں ہے تو لے لے اس کی قسمت سے اوپر والا اور بھی دے سکتا ہے لیکن اس کی بیوی نے اپنے آدمی کو ایسے گھورا کہ اس نے ٹھاکر صاحب سے معافی مانگ لی اور بیٹھ گیا۔ پھر لوگ ایک دوسرے سے کان میں باتیں کرنے لگے اور ٹھاکر صاحب کو کوسنے لگے ٹھاکر صاحب نے سب کو خاموش کر کے وہاں کھڑے بھولا کو بلایا بھولا اس پورے گاؤں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس بچے کو اپنا لے اور معصوم کو سہارا دے کر ثواب حاصل کر لے اس کاغذ میں لکھا ہے کہ اس بچے کو کسی نیک ایماندار انسان کو دیا جائے بھولا تمھاری تو ایک ہی بیٹی ہے تم اسے پیار دے دو کل کو یہ بڑا ہو کر تمھارا سہارا بن جائے گا بھولا تمھیں پتہ ہے اپنے بچے کے ساتھ اس کی ماں نے اس بکس میں کیا چھوڑا ہے اس بکس میں اس بچے کی ماں کے قیمتی گہنے اور ستر ہزار روپے رکھے ہیں ٹھاکر صاحب کی بات سن کر سب گاؤں والے حیران رہ گئے ایک دوسرے پر آنکھیں چڑھا کر کہنے لگے اس کلموہی کے پاس اتنے گہنے اور روپے ہوں گے ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پہلے والی عورت بولی اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں ٹھاکر کے کہنے سے پہلے ہی بچہ اور بکس اپنے گھر لے جاتی ایک اور عورت بولی ہم نے زبان کھول کر بڑی غلطی کی ایک آدمی اپنی بیوی کو ڈانٹتے ہوئے بولا اری میں نے تو پہلے ہی کہا تھا لے لے اس بچے کو اپنے چار بچوں کے ساتھ یہ بھی گھر میں پڑا رہے گا لیکن تو نے نہیں سنی دیکھ کتنا بڑا نقصان ہو گیا، سب ہاتھ سے نکل گیا۔ لاؤ مالک مجھے دیدو میں بیوی کی بات نہیں مانوں گا اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گا ٹھاکر صاحب غصے سے بھڑک گئے دور ہو جا میری نظروں سے میں نے تجھ سے لینے کو کہا تو بیوی کی باتوں میں آ کر بیٹھ گیا لعنت ہے تم دونوں پر ٹھاکر صاحب کی باتیں سن کر ان کا سر شرم سے جھک گیا۔ سارا گاؤں خاموش تھا۔ لوگ ٹھاکر صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ اب کیا فیصلہ ہو گا۔ انھوں نے بھولا سے کہا کہ تم بیٹے کی چاہ میں مسجد مندر درگاہ اور ہر بزرگ کے پاس جاتے ہو بلکہ بھٹک رہے ہو اس لیے اوپر والے نے سب سے پہلے اس بچے کو تمھیں دکھایا جب یہ بچہ تمھیں ملا تو اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اگر تم چاہتے اس بکس کو چپکے سے اپنے گھر لے جا سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا بچے اور بکس کو لے کر سیدھے میرے پاس چلے آئے آج اس پورے گاؤں میں میں تم سے زیادہ ایماندار انسان مجھے نظر نہیں آ رہا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمھاری بیوی اس بچے کو سہارا دیں اور ماں باپ کا پیار دیں اور یہ گہنے اور روپے بینک میں جمع کرا دو اس سے جو پیسہ ملے اس سے دونوں کی پرورش کر لینا اتنا کہہ کر انھوں نے بچے کو بھولا کی طرف بڑھا دیا۔ تو بھولا کی بیوی نے خوش ہو کر بچے کو باہوں میں اٹھا لیا تبھی بھولا وہ بکس اپنے ہاتھ میں لیے

ٹھاکر صاحب کے قدموں میں گر کر رونے لگا اور معافی مانگنے لگا سرکار مجھے معاف کر دیں آپ جیسا سوچتے ہیں میں اتنا ایماندار نہیں ہوں سرکار کل صبح جب میں اس بچے کے قریب پہنچا تب بکس میں ستر ہزار نہیں بلکہ 75 ہزار روپے تھے پیسہ دیکھ کر میری نیت میں کھوٹ آگیا اور میں نے پانچ ہزار چرا لیے سوچا کہ ایک جانور خرید کر دودھ بیچوں گا تو گھر کے حالات سدھر جائیں گے مالک لالچ میں آکر وہ روپے میں نے رکھ تو لیے لیکن میرا ضمیر نہیں مانا۔ میری روح میرا ضمیر مجھ پر لعنت ملامت کرنے لگے میں یہ بات اپنی بیوی سے بھی نہیں کہہ سکا اور کل سے ایک بوجھ لیے میں رات بھر سو نہیں سکا، سرکار میں ویسا نہیں ہوں جیسا آپ سوچتے ہیں یہ رہے پانچ ہزار روپے مجھے معاف کر دیجیے اتنا کہہ کر بھولا نے پانچ ہزار روپے ٹھاکر صاحب کو دے دیے۔

تبھی ایک آدمی بولا آپ تو بھولا کو ایمانداری کا تحفہ دے رہے تھے لیکن یہ تو پکا چور نکلا ٹھاکر صاحب بہتر ہوگا کہ یہ بچہ آپ مجھے دے دیں بچہ میرے گھر پر بڑا ہوگا تو چور تو نہیں بنے گا۔ اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگا اس کے ساتھ گاؤں کے بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔ تبھی ٹھاکر صاحب بولے گاؤں والوں اگر بھولا چور ہوتا تو وہ یہاں سب کے سامنے کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنی غلطی نہیں مان لیتا آج بھولا یہاں اپنی زبان بند رکھتا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی آواز سنی اپنے ضمیر کو مارا نہیں۔ اور سب کے سامنے اپنا بوجھ اتار کر رکھ دیا اس لیے میں اب بھی یہ ہی کہوں گا کہ اس بچے کو ایمانداری کے ساتھ پالنے والا بھولا کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا بھولا اپنی امانت سنبھالو تبھی اس ابھاگن کی روح کو سکون ملے گا اتنا کہ ٹھاکر صاحب نے وہ بکس بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ٹھاکر صاحب اور بھولا کو معلوم تھا کہ اس بکس میں گہنے نہیں تھے وہ تو ٹھاکر صاحب گاؤں والوں کا امتحان لینا چاہیے تھا اس لیے ایسا کہا۔

❑❑❑

Chashma Farooqui
25/3 Jogabai
Jamia Nagar, New Delhi-110025

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ رمنی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

دستخط

ذکیہ شیخ مینا

غزلیں

حسنِ سخن

بند آنکھوں میں اتر میری نظر سے پہلے
بت تخیل میں بنالوں گی سحر سے پہلے

آتشِ عشق جگا اور شرارہ بن جا
تو ضروری ہے بہت رقصِ شرر سے پہلے

یہ شکستہ پری پہنچائے گی تا حدِ افق
عزم راسخ ہو اگر وقتِ سفر سے پہلے

راستہ خود ہی بنالے گا یہ رفتار کا جوش
گامِ اولیٰ کا تذبذب ہے ڈگر سے پہلے

پرچمِ نور لیے تیرگیٔ شب سے لڑے
ہنس کے بجھتے ہیں دیے نورِ سحر سے پہلے

بس تکبر نے ہی ابلیس کو ملعون کیا
رب کا پیارا تھا وہ تکفیرِ بشر سے پہلے

میناؔ آداب محبت سے سجا روح و نظر
اپنی ہستی کو مٹا پیشِ نظر سے پہلے

عجیب رنگِ گلستاں دکھائی دیتا ہے
ہر ایک پھول ہراساں دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کیسی ہوائیں چلی ہیں عالم میں
ہر اک بشر مجھے شیطاں دکھائی دیتا ہے

فریب ہستیٔ دوراں نہ پوچھئے ہم سے
کہ راہزن بھی نگہباں دکھائی دیتا ہے

کب اپنا عیب نظر اپنی آنکھ کو آیا
یہ دل ہر ایک سے نالاں دکھائی دیتا ہے

تری نظر کے اشارے پہ میری جاں صدقے
نئی سحر کا یہ عنواں دکھائی دیتا ہے

گلے گلے جو ہے ڈوبا جنونِ عشق میں دل
ہر ایک زخم ہی درماں دکھائی دیتا ہے

ندیم تجھ سا میسر جسے بھی ہو میناؔ
وہ اپنے بخت پہ نازاں دکھائی دیتا ہے

Zakia Sheikh
302,303, Blue Nest Building,
Plot No. 74, Sector No.9
New Panwel, Navi Mumbai-410206 (MS)

نینا عادل

بقا کی جنگ

میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں
میرے ابو جب کام پہ جاتے، تو ان کے لوٹ کے آنے تک
صحن میں دھول اڑاتی مٹی، سانسوں میں خدشے بھرتی تھی
امی خود بھی چپ چپ رہتیں، ہم بھی شور نہ کرنے پاتے
میں اس گھر کی دیواروں پہ لکھی خوف کی بھاشا پڑھ سکتی تھی
میں ایک مہاجر کی بیٹی......
چھ نمبر کی پھولوں والی ایک گلی میں
کالج کے اک اسٹوڈنٹ کی لاش پڑی ہے! دہشت گرد ہے
میری سہیلی کی ہاتھوں میں اس کا خط ہے جس میں بس اتنا لکھا ہے
’زندہ رہا تو عشق کروں گا‘
اس دن صدر میں، بندوقوں کی تڑ تڑ تڑ میں
میں کالج کے ڈیسک کے اوپر کھرچ کھرچ کے لکھ آئی تھی
میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں
میرے دادا دکن سے اخبار، کتابیں اور مصلیٰ لائے تھے
اور میری دادی! ساڑھی، خاموشی اور آنسو......
ان کے چہرے کی شکنوں میں جذب اداسی اور ہجرت، میں
اپنی ہری رگوں میں، شریانوں میں اور بدن کے ہر خلیے میں سمو چکی ہوں
میں نے کراچی کی گلیوں سے عشق کیا ہے
مجھ میں میرا کل زندہ ہے، مجھ میں میرا آج بپا ہے
میں ایک مہاجر کی بیٹی ہوں
اور میرے بچوں کا ورثہ ہے
جنگ بقا کی......

(بشکریہ زبان و ادب، جولائی 2018)

حسن سخن

خالدہ عظمیٰ

غزل

وہ جس کا ساتھ نبھانے کا حوصلہ نہ ہوا
بچھڑ گیا تو بھلانے کا حوصلہ نہ ہوا

ادھر ادھر کے سنائے ہزار افسانے
دلوں کی بات سنانے کا حوصلہ نہ ہوا

یہ اور بات کہ با حوصلہ ہوں میں پھر بھی
نئے چراغ جلانے کا حوصلہ نہ ہوا

خلیج کتنے زمانوں کی کر گیا پیدا
وہ اک قدم کہ اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

کتاب ذہن کا کوئی ورق بھی سادہ نہیں
لکھے حروف مٹانے کا حوصلہ نہ ہوا

گزر گئی تھی شب ہجر ہجر میں عظمیٰ
چراغ پھر بھی بجھانے کا حوصلہ نہ ہوا

حسنِ سخن

حمیرا رحمان

غزل

لوگ تو اک منظر ہیں تخت نشینوں کی خاطر
فرش بچھایا جاتا ہے قالینوں کی خاطر

کتنی بے ترتیبی پھیلی کیا کچھ ٹوٹ گیا
سجے سجائے گھر تھے انہی مکینوں کی خاطر

ٹھہر گئے ہیں عین سفر میں بن سوچے سمجھے
ہم سفری کے کچھ بے نام قرینوں کی خاطر

جل بجھتے ہیں لوگ کسی کو فیض پہنچنے پر
گر جاتے ہیں کچھ بے معنی زینوں کی خاطر

ہم اور تم جو بدل گئے تو اتنی حیرت کیا
عکس بدلتے رہتے ہیں آئینوں کی خاطر

اونچے دام لگے ہیں حمیرا کورے جذبوں کے
سودا برا نہیں ہے چند مشینوں کی خاطر

حیا لکھنوی

غزل

چمن وہی ہے گھٹائیں وہی بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی

ہے دلکشی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیت رنگ و بو نہیں باقی

شباب دہر کی اب بھی ہے وہ فراوانی
مگر خیال میں جوش نمو نہیں باقی

ہے دل میں درد بھی پہلو میں دل بھی ہے لیکن
کسی کے درد پہ رونے کی خو نہیں باقی

حرم کی شمع فروزاں ہے آج بھی لیکن
تجسس نظر شعلہ جو نہیں باقی

گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیاؔ اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

لذیذ پکوان

زردہ

اجزا: دو کپ چاول، ایک کپ چینی، چھوٹی الائچی تین عدد، بادام چھ عدد، پستہ چھ عدد، ناریل حسب ضرورت، گھی تین چمچ

ترکیب: چاول دو کنی ابال کر پانی اتار کر رکھ لیں گھی کو گرم کریں اور چینی ڈال کر آدھا کپ دودھ ڈال دیں جب چاشنی ایک تار کی طرح ہو جائے تو چاول ڈال کر مکس کریں بعد میں تمام میوہ ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھیں چاول ابالتے وقت آدھائی سپون زردہ کا رنگ ڈال دیں میوہ بھی تھوڑا سا بادام وغیرہ کے ساتھ ڈالنا نہ بھولیں لیجئے گرما گرم زردہ تیار ہے۔

بادام کا حلوہ

اجزا: بادام کا پیسٹ ایک کپ، گھی ایک کپ، سوجی دو سو پچاس گرام، دودھ دو کپ، چینی آدھا کپ، کھویا دو سو پچاس گرام، آلمنڈ ایسنس ایک چائے کا چمچ، بادام سجاوٹ کے لیے

ترکیب: گھی کو گرم کرکے اس میں سوجی ڈال کر بھون لیں یہاں تک کہ خوشبو آنے لگ جائے۔ پھر دودھ، چینی اور بادام پیسٹ ڈال کر مکس کرلیں اور فرائی کرلیں۔ اب کھویا، آلمنڈ ایسنس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں یہاں تک کہ گھی اوپر آجائے۔ سرونگ پلیٹر میں نکال کر بادام سے سجا کر پیش کریں۔

گول گپے بنانے کی ترکیب

اجزا: سوجی ایک کپ، میدہ آدھا کپ، ماش کی دال کا آٹا دو کھانے کے چمچ، کلب سوڈا گوندھنے کے لیے، تیل ڈیپ فرائی کے لیے

فلنگ کے لئے: آلو ایک کپ (اُبلے ہوئے)، بوندی دو کپ

کھٹے پانی کے لئے: پودینہ کے پتے آدھا گٹھی، ہری مرچ تین عدد، پانی ایک لیٹر، املی کا گودا آدھا کپ، دھنیا ایک چائے کا چمچ بھنا اور پسا ہوا، زیرہ ایک کھانے کا چمچ بھنا اور پسا ہوا، لال مرچ آدھا چائے کا چمچ پسی ہوئی، پسا ہوا نمک آدھا چائے کا چمچ، ادرک دو کھانے کے چمچ کٹے ہوئے، لیموں کا رس تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب: کھٹے پانی کے لئے: بلینڈر میں پودینہ کے پتے، ہری مرچ اور کٹی ادرک ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔ اب اس پیسٹ کو پانی میں شامل کر دیں۔ ساتھ ہی املی کا گودا، بھنا اور پسا دھنیا، بھنا اور پسا زیرہ، پسی لال مرچ، نمک اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ اس کے بعد کھٹے پانی کو چھان کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ گول گپے کے لیے: ایک پیالے میں سوجی، میدہ اور ماش کی دال کا آٹا مکس کریں۔

پھر اسے حسب ضرورت کلب سوڈا ڈال کر گوندھ لیں۔ آٹے کو تیس منٹ کے لیے رکھ دیں، پھر اسے دوبارہ گوندھیں۔ اب ہتھیلی پر تھوڑی سی چکنائی لگا کر چھوٹے پیڑے بنائیں۔ ہر پیڑے کو چھوٹی پوری کی شکل میں بیل لیں اور گیلے کپڑے کے درمیان میں دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ آخر میں اسے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر اتنا فرائی کریں کہ پھولنے لگیں۔ پھر آنچ تیز کر کے کرسپی ہو جانے تک فرائی کریں۔ پیش کرنے کے لیے: انگوٹھے کی مدد سے ایک گول گپے میں سوراخ کریں۔ اس میں اُبلے آلو اور پانی میں دس منٹ بھیگی ہوئی بوندی بھریں۔ اگر پسند ہو تو املی کی چٹنی بھی ڈالیں۔ آخر میں ٹھنڈے کھٹے پانی کے ساتھ پیش کریں۔

میٹھی باقر خانی

اجزا: میدہ تین کپ، سوجی ایک کپ، دیسی گھی دو کھانے کے چمچ، دودھ تین کھانے کے چمچ، چینی چار کھانے کے چمچ، ہری الائچی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، پانی گوندھنے کے لئے

ترکیب: ایک بڑے پیالے میں میدہ، سوجی، گھی، دودھ، چینی، ہری الائچی پاؤڈر اور نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر آہستہ آہستہ پانی شامل کر کے نرم ڈو گوندھ لیں۔ ڈو کو گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر آدھا گھنٹے کے لئے چھوڑ دیں۔ ڈو کو آٹھ برابر حصوں میں تقسیم کر لیں اور پیڑے بنا لیں۔ پھر آٹھ انچ ڈایا میٹر میں رول

کر لیں۔ اب اوون میں بارہ منٹ کے لئے بیک کر لیں یا کرسپی اور براؤن ہونے تک بیک کریں۔ مکھن سے برش کریں اور چائے کے ساتھ سرو کریں۔

پاستا ماستا

باہر یعنی بیرون ملک پاستے کی قسم قسم کی اشکال واقسام ملتی ہیں کوئی بھی لیں سب ایک سے ذائقے کی ہوتی ہیں۔ پاستا کا پکانا تھوڑا سا محنت طلب ہے لیکن یہ آپ پر ہی منحصر کرتا ہے اگر آپ میرے والا پاستا کھانا چاہتے ہیں تو پاستا لیں دس منٹ کڑاہی (نان اسٹک) میں ابالیں اس کے

بعد پانی سوکھنے پر جو جو مصالحے پڑے ہیں وہ ڈال دیں، ٹماٹر کا پیسٹ ڈال دیں، کوئی اور کیچ اپ یا پیسٹ ہے وہ ڈال دیں یعنی ہر نمکین شے ڈال کر ہلکا سی گھی ڈال کر بھون لیں اور پاستا تیار۔ اگر آپ مشکل والا پکانا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی لے آئیں بازار سے سبزیاں، چھوٹے قسم کی چیزیں اور چھیل کاٹ کر سب کو پاستے کے ساتھ بوائل کر لیں اور آخر میں گھر میں موجود ساری نمکین چیزیں ملا کر بھون لیں۔ میرے والا پاستا پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا جب کہ یہ والا پاستا چھیل کاٹ میں وقت لے لے گا اور خرچہ بھی زیادہ۔

شہبا خاتون

آخر ڈینگو ہے کیا بلا؟

شہروں میں ہر برس جس طرح جاڑا، گرمی اور برسات کے موسم آتے ہیں بالکل ویسے ہی ایک اور موسم بھی آتا ہے اور وہ ہے ڈینگو کا موسم۔ جی ہاں، یہ وہی موسم ہے جب اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈ مریضوں سے بھر جاتے ہیں۔ سال کے باقی دن مکھیا مارنے والے کلینک بھی چاندی کاٹنے لگتے ہیں اور ہر دو چار گھر چھوڑ کر آپ کو تیز بخار میں دہکتا کوئی مریض مل سکتا ہے۔ ڈینگو کا اثر بڑی تیزی سے ہوتا ہے اور اگر بروقت علاج نہ ہو تو یہ نہ صرف خطرناک ہو جاتا ہے بلکہ اکثر جان لیوا بھی بن جاتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ یہ ڈینگو کیا بلا ہے؟۔

ڈینگو کیا ہے؟

ڈینگو مچھروں سے پھیلنے والی بیماری ہے۔ اس بیماری کو پھیلانے میں جس مچھر کا ہاتھ ہے اسے ایڈیز ایجپٹی ٹائیگر کہا جاتا ہے۔ اس نسل کی مادہ مچھر اس بیماری کو پھیلانے کے لئے ذمہ دار ہے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن میں مچھروں سے متعلق بیماریوں کی روک تھام والے محکمہ میں طویل عرصے تک کام کر چکے سید علی عباس نقوی بتاتے ہیں کہ ڈینگو کے بارے میں لوگوں کو خاص طور پر ان شہروں کے افراد کو باخبر رہنا چاہیے جہاں اس بیماری کا اثر تقریباً ہر برس دیکھا جاتا ہے۔ یہ مچھر ایک دوسرے کا خون چوس کر ڈینگو کے وائرس کو منتقل کر دیتا ہے۔

ہر بخار ڈینگو نہیں لیکن ہوشیار

ڈینگو ایک خاص قسم کا وائرل مرض ہے جو بخار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ ڈینگو کے سیزن میں لوگ ڈرے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے کہیں کہیں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عام بخار کے مریض بھی خود کو ڈینگو کا مریض سمجھ لیتے ہیں۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ لوگ چوکس رہیں لیکن کچھ مریض اس کے برعکس رویہ بھی اپناتے ہیں جو خطرناک ہو سکتا ہے۔ کئی بار شدید بخار اور ڈینگو کی واضح علامات ہونے کے باوجود لوگ اسے عام بخار سمجھ کر گھریلو نسخوں سے حل کرنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے یہ بخار جان لیوا ہونے کی طرف بڑھ جاتا ہے اور کئی بار دیکھنے میں آیا کہ جب تک مریض کو ڈاکٹری مدد ملی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ مطلب ڈینگو کے موسم میں پہلا اصول یہی ہے کہ چوکس رہیں اور بخار ہونے کی صورت میں غور سے دیکھیں کہ کہیں یہ ڈینگو بخار تو نہیں ہے؟۔

ڈینگو کی علامتیں

ڈینگو بخار سے بچنے اور محتاط رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں اس کی علامات کا پتہ ہو تاکہ ان کا پتہ چلتے ہی ہم چوکس ہو جائیں اور فوراً ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔ ڈینگو کی علامتیں عام بخار سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ یہ بخار تیز ہوتا ہے اور جسم میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ مریض کو چکر آتا ہے، منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے اور الٹیاں بھی آتی ہیں۔ سر درد، کمر میں درد اور بدن درد کی بھی شکایت ہونے لگتی ہے۔ کئی لوگوں کی جلد پر ریشیز بھی ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زور دیتے ہیں کہ جیسے ہی بخار 104 ڈگری فارین ہائٹ تک پہنچ جائے اور ساتھ ہی ساتھ سر میں شدید درد اور آنکھوں کے پیچھے درد محسوس ہو، جوڑ دکھنے لگیں تو خبردار ہو جانا چاہیے کہ یہ ڈینگو کا معاملہ ہو سکتا ہے۔

کیسے پھیلتا ہے ڈینگو

ڈینگو بخار اس مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے جو پہلے کسی ڈینگو کے مریض کو کاٹ چکا ہو۔ ان مچھروں کا قہر برسات میں زیادہ ہوتا ہے اور یہ ان جگہوں پر زیادہ پھیلتے ہیں جہاں انہیں ٹھہرا ہوا صاف پانی ملے۔ ڈینگو کے وائرس کے ایک انسان سے دوسرے کے جسم میں منتقل ہونے کا ذریعہ

یہ مچھر ہی ہوتے ہیں۔ ڈینگو ان افراد کو زیادہ جلدی شکار بناتا ہے جن کے جسم کی قوت مدافعت کمزور ہوتی ہے۔ ڈینگو بخار ایک ہی شخص کو کئی بار بھی ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں ڈینگو کی مختلف شکلیں ہوں گی۔ ڈینگو کے مچھر کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ دن میں کاٹتا ہے۔

ڈینگو کی علامات ظاہر ہوں تو کیا کریں؟

ہمارے یہاں عام طور پر بخار ہونے کی صورت میں لوگ گھر میں ہی موجود پیراسیٹامول جیسی دوائیں لینے لگتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈینگو کے مریض کو علاج ملنے میں ہونے والی تاخیر خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ جیسے ہی شک ہو کہ کسی کو ڈینگو ہو سکتا ہے اسے فوراً ڈاکٹر کو دکھانا چاہئے۔ ڈاکٹر عام طور پر ایسے مریض کے خون میں پلیٹلیٹس کی تعداد چیک کرتے ہیں۔ ڈینگو کے باوجود گھر میں ہی علاج کروانے والوں کو کئی باتوں کا دھیان رکھنا چاہئے۔ اکثر مریض منہ کا ذائقہ خراب ہونے اور کمزوری کے سبب غفلت کی وجہ سے کھانے پینے میں ٹال مٹول کرتے ہیں اس کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ پلیٹلیٹس کا تیزی سے کم ہونا خطرے کا اشارہ ہے ایسے میں جتنی جلد ممکن ہو میڈیکل خدمات مہیا کرائی جانی چاہئیں۔ اگر کسی مریض کو خون آنے لگے تو اسے بلا تاخیر کئے فوراً اسپتال پہنچانا چاہئے ورنہ یہ جان لیوا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ڈینگو میں پلیٹلیٹس کی تعداد گھٹنے سے روکنا سب سے پہلا اور سب سے بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے ڈاکٹروں کی نگرانی میں فوری علاج نہ ہونے کی صورت میں معاملہ جان لیوا بن سکتا ہے۔ زیادہ تر معاملات میں دیکھا گیا ہے کہ بے توجہی کی وجہ سے ڈینگو کی علامات کے باوجود مریض کو مناسب علاج نہیں مل پاتا اور پلیٹلیٹس گرتے گرتے اس مرحلہ تک چلی جاتی ہیں کہ خون آنے لگتا ہے۔ چونکہ پلیٹلیٹس کا ہمارے جسم کے خون کو جاری ہونے کی صورت میں روکنے میں اہم کردار ہوتا ہے اس لیے پلیٹلیٹس کم ہو جانے پر بلیڈنگ کا سلسلہ بند نہیں ہو پاتا۔

ڈینگو کا بڑھتا دائرہ

ڈینگو کے بارے میں عالمی صحت تنظیم یا ڈبلیو ایچ او کا کہنا ہے کہ حالیہ دہائیوں میں اس مرض کا دائرہ تیزی سے بڑھا ہے۔ اب اس بیماری کا خطرہ دنیا کی تقریباً آدھی آبادی کو ہے۔ اس بیماری کے زیادہ تر معاملات شہری اور نیم شہری علاقوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ ڈینگو کا کوئی مخصوص علاج نہیں ہے لیکن فوری طبی مدد سے اس کے نقصانات کو کم کیا جا سکتا ہے اور مرض کو اس حد تک جانے سے روکا جا سکتا ہے جہاں وہ جان لیوا ہو جائے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ڈینگو کا دائرہ وسیع ہونے میں برسات، درجہ حرارت اور بنا منصوبے کے شہروں کا بڑھتا دائرہ بھی ذمہ دار ہے۔ ڈبلیو ایچ او کی ایک رپورٹ بتاتی ہے کہ 1970 سے پہلے تک ڈینگو کی جان لیوا شکل صرف 9 ممالک میں دیکھی گئی تھی لیکن اب یہ بیماری دنیا کے 100 سے زیادہ ممالک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کتنی تیزی سے دنیا کو اپنے لپیٹے میں لے لیا ہے۔

ڈینگو سے کیسے بچیں؟

ڈینگو سے بچنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ اپنے آس پاس صاف پانی جمع نہ ہونے دیا جائے۔ کولر اور ٹائروں میں جمع برسات کا صاف پانی یا پھر ایسا صاف پانی جو زمین کے رابطے میں نہ ہو ایڈیز ایجپٹی ٹائیگر مچھر کی پیداوار کے لیے سب سے موزوں جگہ ہے اس لئے برسات میں اس کا خیال رکھیں۔ جب بھی ڈینگو کی علامات محسوس ہوں فوری طور پر ڈاکٹر سے ملنا چاہئے تاکہ بیماری مزید سنگین نہ ہو۔

Shahba Khatoon
M-50 A, Near Chinar Appartment
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi-110025

حسن کی نگہداشت

اجلی اور روشن آنکھوں کا راز

آنکھوں کے حوالے سے چند کار آمد ٹوٹکے اور ورزشیں جس نہ صرف آپ اپنی بینائی میں نمایاں فرق محسوس کریں گی بلکہ آپ کی آنکھیں اجلی اور روشن ہو جائیں گی۔

☆ کھانا کھا کر آنکھوں پر گیلا کپڑا پھیرنا بینائی کے لئے مفید رہتا ہے۔
☆ شوقیہ عینک لگانے اور ناک کے بال اکھاڑنے سے گریز کریں اس سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔
☆ مرچیں اور کھٹائی کا زیادہ استعمال آنکھوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اس سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔
☆ آنکھیں جھپکے بغیر خالی گھڑے میں کچھ دیر دیکھتے رہیں یہ آنکھوں کی بہترین ورزش ہے۔
☆ سر پر بار بار کنگھی کرنے کی عادت آنکھوں کو صحت مند رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔
☆ دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے اور سینے پرونے سے نظر خراب ہو جاتی ہے۔
☆ بالوں کو تیز گرم پانی سے دھونا اثر انداز ہو سکتا ہے ہمیشہ نیم گرم یا ٹھنڈے پانی سے دھوئیں۔
☆ سورج کی طرف براہ راست دیکھنا، آنکھوں کے لئے نقصان دہ البتہ چاند کی طرف گھنٹہ نصف گھنٹہ دیکھنا بینائی تیز کرتا ہے۔
☆ ہر صبح آنکھیں اور چہرہ باسی ٹھنڈے پانی سے دھوئیں اس سے بینائی بڑھے گی اور کیل مہاسے بھی ختم ہوں گے۔
☆ پشت کے بل لیٹ کر یا تکیہ لگا کر پڑھنا بینائی کو تباہ کر دیتا ہے۔
☆ کھیرے کے پتلے پتلے قتلے کاٹ کر آنکھوں پر پانچ سے دس منٹ رکھیں تھوڑی دیر بعد قتلے ہٹا کر آنکھیں سادے پانی سے دھو لیں۔ آنکھوں کی چمک بڑھانے کے لئے یہ نسخہ بہترین ہے۔
☆ صبح کے وقت عرق گلاب کے چھینٹے آنکھوں پر مارنے سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔
☆ خالص شہد آنکھوں میں لگانے سے نظر تیز ہوتی ہے۔
☆ پانی ابال کر ٹھنڈا کر لیں اس میں نمک ڈال کر شیشے کی بوتل میں محفوظ کر لیں روزانہ اس پانی سے آنکھیں دھوئیں۔
☆ نیم گرم دودھ روئی میں بھگو کر چند منٹ آنکھوں پر رکھیں پھر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔ آنکھوں میں قدرتی چمک اور خوبصورتی آ جائے گی۔

گھر پہ میک اپ کیسے کریں

اگر آپ دلکش نظر آنا چاہتی ہیں تو صاف ستھرا میک اپ کیجیے۔ آپ عمر کے جس حصے سے بھی گزر رہی ہوں، میک اپ لازمی ہے۔ عمر کے مطابق میک اپ کریں تو خود کو بہتر بھی محسوس کریں گی اور سوبر بھی۔ آج کل میک اپ صرف

چہرے کو نمایاں کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ چہرے کے خدوخال واضح کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے جس طرح ایک تصویر کو بنانے کے لیے ایک صاف ستھرے کینوس کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اسی طرح میک اپ سے قبل چہرے کا صاف ستھرا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اگر چہرے پر پہلے سے میک اپ ہے تو اسے اچھی طرح صاف کرلیں، صاف ستھرے چہرے پر میک اپ جچتا بھی ہے اور دیرپا بھی ہوتا ہے۔

موئسچرائزر: بازار میں موئسچرائزر اور لوشن کی بھرمار ہے مگر آپ معیاری موئسچرائزر کا انتخاب کرلیں۔ موئسچرائزر کا کام چہرے کی جلد کو نرم اور ملائم رکھنا ہوتا ہے۔ انھیں فاؤنڈیشن اور بیس سے قبل لگایا جاتا ہے گویا یہ جلد اور باہر کے گردوغبار کے درمیان ایک دیوار کی طرح کام کرتا ہے۔ فاؤنڈیشن یا بیس لگانے سے پانچ منٹ قبل اسے لگائیں، اگر یہ زیادہ لگ جائے تو ٹشو پیپر سے صاف کرلیں۔

میک اپ بیس: اسے استعمال کرنے کے لیے اسفنج کی ضرورت ہوتی ہے، جو قدرے گیلا ہو۔ چہرے کے درمیان سے شروع کریں اور باہر کی طرف لگائیں، تھوڑی اور گالوں پر اچھی طرح لگائیں اگر زیادہ لگ جائے تو ٹشو پیپر سے ہلکا کرلیں بہتر ہوگا کہ بیس یا فاؤنڈیشن کو ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اسفنج کی مدد سے لگائیں۔

کنسیلر: اگر آپ کا چہرہ داغ دھبوں سے پاک ہے تو پھر آپ کو کنسیلر کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر داغ دھبے ہیں تو پھر انھیں کنسیلر کی مدد سے چھپانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کنسیلر کو آنکھوں کے نیچے موجود سیاہ حلقے کو بھی چھپانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ خود کو غور سے آئینے میں دیکھیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کنسیلر کی ضرورت کہاں ہے۔

بلشر: اس کے استعمال سے میک اپ کی فنشنگ آسان ہو جاتی ہے اور حسب منشا شیڈ بھی مل جاتا ہے اس کی مدد سے آپ چہرے کو چھوٹا، بڑا، بیضوی اور لمبوترا ٹچ بھی دے سکتی ہیں برش کی مدد سے اسے لگائیں۔ کنپٹی کے پاس سے شروع کرکے گال کی ہڈی تک لائیں مگر جیسے جیسے ہڈی کی طرف جائیں شیڈ کو ہلکا کرتی جائیں۔

آئی برو: آئی برو نہ صرف آنکھوں کو ایک فریم عطا کرتا ہے بلکہ آپ کے پورے چہرے کو ایک تاثر بھی بخشتا ہے۔ تھریڈنگ، ٹویزنگ یا آئی برو پنسل کی مدد سے آپ انھیں نیچرل شیپ دے سکتی ہیں۔ آئی برو کو آئی برو پنسل کی مدد سے درست کرلیں، پہلے چھوٹے اور ہلکے اسٹروک لگائیں تاکہ آؤٹ لائن غلط بن جائے تو اسے صاف کیا جاسکے۔ آئی برو کے کناروں پر ہاتھ بالکل ہلکا رکھیں۔

آئی پنسل اور لائنر: ان کے استعمال سے آنکھ کی قدرتی بناوٹ واضح ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ نرم پنسل استعمال کریں تاکہ جلد پر خراش نہ پڑے اور جو آسانی سے پاؤڈر اور آئی شیڈ و لوشن یا کریم میں اچھی طرح مکس ہو جائے۔ اس کی مدد سے پلکوں کے درمیان کے تین چوتھائی حصے کو استعمال میں لائیں اس کے بعد برش کی مدد سے زائد شیڈز کو صاف کردیں پنسل لائن گہری ہو جائے تو اسے براؤن شیڈ سے ہلکی کرلیں۔

مسکارا: اس کی مدد سے آنکھیں متوازن ہو جاتی ہیں یہ پلکوں کو موٹا اور گہرا کرتا ہے۔ دراصل یہ آنکھوں کے میک اپ کا فنشنگ ٹچ بھی ہے اسے استعمال کرتے وقت شیشے کے سامنے چہرے کو اس طرح دیکھیں کہ پلکیں واضح طور پر نظر آئیں پہلے اوپر کی طرف سے جڑ سے شروع کرکے کنارے کی طرف آئیں اس دوران پلکوں کو برش کی مدد سے اوپر کی طرف بھی اٹھائیں۔ اس کے بعد نیچے کی طرف لگائیں اگر آپ کی پلکیں کرل نہیں ہو پاتی ہیں تو آپ مصنوعی کرلر استعمال کر سکتی ہیں۔

ہونٹ: ہونٹوں کو رنگین بنائے بغیر کوئی میک اپ مکمل نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے جو بھی شیڈز پسند کریں وہ دیگر شیڈز سے مطابقت رکھتا ہو۔ مثلاً بلشر اور میک اپ کے شیڈز سے ہونٹوں کو سجانے کے لیے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک لپ لائنر دوسری لپ اسٹک۔ لپ لائنر کی مدد سے آپ ہونٹوں کو بڑا اچھوتا روپ عطا کرسکتی ہیں۔ پنسل کو اوپر ہونٹ کے درمیان سے دونوں کناروں تک استعمال کرتے ہوئے لگائیں۔ ہاتھ ذرا ہلکا ہے۔ یہی عمل نیچے والے ہونٹ کے ساتھ کریں اس عمل سے فارغ ہو کر لپ اسٹک کا استعمال کریں۔ لپ اسٹک اس انداز سے لگائیں کہ بھرپور ہو۔ اگر کٹے پھٹے نظر آئیں تو لپ برش کی مدد سے اسے برابر کرلیں۔ یہ نہ ہو کہ کہیں گہرا اور کہیں ہلکا نظر آئے۔ اگر آپ انھیں چمک دمک عطا کرنا چاہتی ہیں تو گلوس یا گلیز شائن کی مدد سے ایسا کرسکتی ہیں۔

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

ماہ جون کے شمارے میں میرا افسانہ ''میراث'' شائع کرنے کے لیے شکریہ۔ ''خواتین دنیا'' کی جملہ مشمولات بھی بہت خوبصورت اور معیاری ہیں۔ رسالہ ہر ماہ پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے جاذب نظر اوراق پر دلچسپ مضامین متاثر کن لگتے ہیں۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

شاہدہ شاہین، میسور، کرناٹک

آج ایک دہلی کی دوست کے ذریعہ خواتین دنیا کے چند شمارے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اتنے بڑے اور مشہور ماہنامے میں میری غزل شائع ہوئی تھی۔ ہم جیسے نئے لکھنے والوں کی اس سے بڑی ہمت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم آپکے بہت ہی مشکور و ممنون ہیں۔ بس آپ سے ایک التجا ہے خواتین دنیا کو ہم نے پورے لکھنؤ میں تلاش کیا، ہمیں کہیں نہیں دستیاب ہو سکی۔ آپ رہنمائی کر دیں اسے کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی محبتوں کی شکر گزار

شہناز فاطمہ صدیقی، اولڈ حیدر گنج، لکڑ منڈی، لکھنؤ (یوپی)

میں نے خواتین دنیا کے کئی شماروں کا مطالعہ کیا ہے اور یہ بات ہر شمارے میں مشترک ہے کہ اس میں بیشتر یا کلی طور پر خواتین کی تحریریں ہی شائع کی جاتی ہیں یہ صحیح ہے کہ یہ رسالہ آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس میں بقیہ آدھی آبادی والے شاعر و ادیب کے مضامین، کہانیاں اور شاعری کو بھی شائع کیا جائے تاکہ یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ وہ خواتین کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں کیا خواتین کے تعلق سے ان کی سوچ میں کوئی مثبت تبدیلی آ رہی ہے یا نہیں۔

ویسے تو خواتین دنیا کے سبھی شمارے اپنے اندر گوناگوں خوبیاں سموئے ہوئے شائع ہوتے ہیں۔ ہر شمارہ پرکشش و دیدہ زیب ہوتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی صاحب سے حجاب امتیاز علی کی گفتگو بہت ہی معلوماتی ہے اس گفتگو سے حجاب امتیاز علی کی افسانہ نگاری سے مکمل تعارف ہو جاتا ہے جو ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت ہی کارآمد ہے۔ ریڈیکل تحریک نسواں میں خواتین کی بہتری اور برتری کے لیے دنیا بھر میں جو تحریکات وجود میں آئیں ان کے اثرات ونتائج اور وجوہات سے مفید آگہی ہو جاتی ہے۔ کہانیوں کا حصہ بھی بہت دلچسپ ہے خاص طور سے سیدہ اشرف کی کہانی 'سپنوں کے سائے'، سرلا دیوی کی کہانی 'کلنک' اور انجم عثمانی کی کہانی 'بک شیلف' ہماری زندگی سے قریب ہیں اور خاص تاثر مرتب کرتی ہیں۔

شعری حصہ میں ملکہ نسیم، نسیم نکہت و آصفہ زمانی کی شاعری بہت پسند آئی۔ مجموعی طور سے پورا رسالہ قابل تعریف اور مبارکباد کا مستحق ہے۔

ذاکرہ خان، پرتاپ گڑھ، یوپی

'خواتین دنیا' اگست 2018 کا شمارہ ہمدست ہوا۔ سرورق بہت ہی پرکشش و بامعنی ہے۔ تحریک آزادی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین کی قربانیاں بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں بیگم حضرت محل، رانی تیس بائی، رانی لکشمی بائی، رام گڑھ کی رانی، بی اماں، عزیزن بائی وغیرہ نے بلاتفریق مذہب وملت ہندوستان کی آزادی

کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا یہاں تک کہ برطانوی حکمرانوں کے ظلم و جبر، گولیوں کی بوچھار، پھانسی کی سزائیں بھی ان کے ملک آزاد کرانے کے جذبہ کو کمزور نہ کر سکیں۔ 'مسلم خواتین اور تحریک آزادی' بہت ہی معلوماتی اور محنت سے تحریر کیا گیا ہے۔ مضمون سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جتنی تحریکیں چلیں اور جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان میں مسلم خواتین بھی صف اول میں موجود ہیں اور آزادی کے لیے کسی بھی طرح کی قربانیاں دینے سے پیچھے نہیں ہٹیں۔

خواجہ عبدالمنتقم صاحب کا مضمون 'خواتین کی اختیار کاری سے متعلق سرکاری اقدامات' بہت ہی مفید ہے۔ حکومت ہند نے خواتین کی فلاح و بہبود اور ان کی معاشی بہتری کے لیے جو اسکیمیں بنائی ہیں ان سے بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔ ان اسکیموں سے خواتین اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اسکیم کا انتخاب کر کے فیضیاب ہو سکتی ہیں۔ اسٹیٹ لیول پر بھی خواتین کے لیے جو اسکیمیں چل رہی ہیں ان سے بھی تعارف کرا دیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

زیر نظر شمارہ میں کہانیاں، مضامین، غزل، نظم سبھی کچھ معیاری اور دلچسپ ہیں۔ ساتھ ساتھ جدید نسل کو بھی زیادہ سے زیادہ شامل کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

حمیرا خانم، میرا روڈ، ممبئی، مہاراشٹر

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کو خوب سے خوب تر بنانے میں آپ کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ جولائی 2018 کے شمارے میں مضمون ''اردو شاعری کی اہم ستیں'' میں مضمون نگار سے سہو ہوا ہے۔ موصوفہ نے دو الگ الگ شخصیتوں یعنی قطب دین قادری فیروز (المعروف بہ فیروز بیدری) اور بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کو ایک ہی سمجھ کر فیروز بیدری کے شعر

مجے ناؤں ہے قطب دین قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

کو بادشاہ فیروز شاہ بہمنی سے منسوب کر دیا۔ یہ دراصل فیروز بیدری کی قدیم دکنی مثنوی پرت نامہ / توصیف نامہ میراں محی الدین کا ۱۱۹ واں شعر ہے۔

فیروز بیدر کا متوطن اور حضرت ابراہیم مخدوم جیؒ کا مرید تھا۔ اس مثنوی میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت مخدوم جیؒ کی مدح شامل ہے۔ مشمولہ مضمون میں ملا وجہی اور ابن نشاطی کے جن اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں شاعر کا اشارہ قطب دین قادری فیروز کی طرف ہے نہ کہ فیروز شاہ بہمنی کی طرف۔ فیروز شاہ بہمنی کا تخلص بیدری نہیں بلکہ عروجی، فیروز اور فیروزی تھا۔ (حوالہ: 'قدیم اردو' جلد اول 1965، ایڈیٹر مسعود حسین خاں، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

ڈاکٹر ضیاء الحسن، ناندیڑ (مہاراشٹر)

اپنی سہیلی کے پاس تازہ شمارہ اگست 2018 دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بے حد پسند آیا۔ خوشنما، دلکش، خوبصورت، دلنشیں کس کس نام سے نوازوں۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ مضامین کا انتخاب، کمپوزنگ، مختلف رنگوں کی آمیزش ساتھ ہی بہترین کاغذ، عمدہ چھپائی بھی کچھ حسن اعلیٰ کا نمونہ پیش کر رہی ہیں۔ سبھی مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور معلوماتی ہیں۔ افسانے ہم عصر زندگی سے قریب اور اسی سماج کے جیتے جاگتے کردار لگتے ہیں۔ شعری تخلیقات اعلیٰ و معیاری ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی ماہنامہ خواتین دنیا اپنا معیار اور اپنے منفرد انداز کے ساتھ جاری رہے گا۔ نوجوان خواتین کے مضامین و تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ موقعہ دیا جائے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ان کے اعتماد میں پختگی آئے۔

دلنشیں نواز، میرٹھ، یوپی

'خواتین دنیا' اگست 2018 موصول ہوا۔ یہ رسالہ واقعی نہایت حسین و جمیل اور پرکشش ہے۔ سرورق پر ہندوستان کی آزادی کے لیے قربانی دینے والی خواتین کی تصویریں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا ملک کی آزادی کے لیے قربانی دینے والی ان خواتین سے نوجوان نسل کافی حد تک ناواقف ہے اور ہمارا اسکولی نصاب بھی اس طرح مرتب کیا گیا ہے جس میں ایسی شخصیات کا ذکر خال خال ہی ہوتا ہے۔ ہندوستانی خواتین خاص طور سے مسلم خواتین پر یہ الزام ہے کہ وہ میدان عمل میں سرگرم نہیں ہیں۔ صرف گھر کی چار دیواری میں خود کو مقید رکھتی ہیں۔ 'مسلم خواتین اور تحریک آزادی' کو پڑھ کر خواتین پر لگے یہ سارے الزام غلط ثابت ہوتے ہیں۔ 1857 سے ہی جنگ آزادی میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا حب الوطنی کے جذبات کو عام کرنے کے لیے دھواں دھار تقریریں اور گاؤں گاؤں جا کر سبھائیں کریں اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کو ملک گیر پیمانے پر مضبوط کرنے میں بہت اہم کردار نبھایا ہے۔ یہ مضمون بہت ہی محنت سے تحریر کیا گیا ہے اور ایسے دور میں جب مرد اساس سماج خواتین کی قربانیوں کو فراموش کرتا جا رہا ہے ایسے میں اس مضمون کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

متن کے انتخاب، رنگوں کی آمیزش، خوبصورت کاغذ، اعلیٰ بائنڈنگ سبھی کچھ بہت ہی معیاری اور دیدہ زیب ہے۔

صبا تبسم، مرادآباد (یوپی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

خواتین کی اختیارکاری وصنفی مساوات

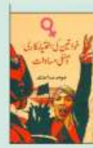

مصنف:خواجہ عبدالمنتقم
صفحات:302
قیمت:145روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب:اکرم نقاش
صفحات:619
قیمت:275روپے

کلیات فراق (غزلیات) جلد اوّل ودوم

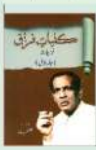

مرتب:جعفر رضا
صفحات:556(اوّل)576(دوم)
قیمت:(سیٹ)520روپے

فلکیاتی بستہ

مصنف:انیس الحسن صدیقی
صفحات:73
قیمت:65روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

مصنف:شمیم طارق
صفحات:411
قیمت:185روپے

کلیاتِ بانی

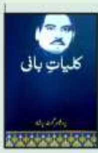

مرتب:پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات:383
قیمت:180روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین:عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات:527
قیمت:230روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف:دھیریندر سنگھ جفا
صفحات:289
قیمت:140روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف:ابراحسنی گنوری
مقدمہ:شمس رمزی
صفحات:129
قیمت:85روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل ودوم)

مرتب:انیس صدیقی
صفحات:1374 مکمل سیٹ
قیمت:580روپے مکمل سیٹ

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتب:ہما مرزا
صفحات:260
قیمت: 145روپے

انتخابِ سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

مرتب:حسرت موہانی
صفحات:321
قیمت:155روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف:محمد حسن
صفحات:373
قیمت:168روپے

شاعری کی تنقید

مصنف:ابوالکلام قاسمی
صفحات:327
قیمت: 155روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف:ڈاکٹر ستیندر رانا ڈوگ
مترجم:ماہر منصور
صفحات:139
قیمت:85روپے

فلکیاتی نظارے

مصنف:انیس الحسن صدیقی
صفحات:73
قیمت:60روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف:انیس الحسن صدیقی
صفحات:50
قیمت:50روپے

دنیائے افسانہ

مصنف:محمد عبدالقادر سروری
صفحات:131
قیمت: 85روپے

شعبۂ فروخت:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک8، ونگ7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2018, Vol. 02, Issue: 9 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025